بلکہ نہایت سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ اسلام میں سجدہ غیر اللہ کے لیے سرے سے جائز ہی نہیں ہے۔

تعظیم و تحیہ سے متعلق امت کا عام رویّہ

قرآن و حدیث کے بعد دوسری چیز جو اس بارے میں دیکھنے کی ہے وہ امت کا ان معاملات میں عام رویّہ ہے۔ مسلمانوں میں سب سے بڑی شخصیت، مرجع عقیدت و احترام ہونے کے لحاظ سے بھی اور سیاست و اقتدار کے اعتبار سے بھی خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ آپ کے صحابہ آپ کو سجدہ کرنا تو درکنار آپ کے لیے بخیالِ تعظیم کھڑے بھی نہیں ہوتے تھے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم احترام و تعظیم کے ان عجمی طریقوں کو پسند نہیں فرماتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کو دلوں پر حکمرانی کا وہ مقام حاصل ہوا کہ بعد کے زمانوں میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ لیکن نہ ان میں سے کسی کے دل میں یہ وسوسہ ہی گزرا کہ وہ مسلمانوں سے سجدہ تحیہ کرائیں، اور نہ مسلمانوں ہی میں سے کسی نے یہ بات گوارا کی کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کے سجدے سے اپنی پیشانی کو داغ دار کرے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانوں میں اگرچہ مسلمانوں کے مجلسی آداب اور ان کی درباری روایات میں بہت سی عجمی بدعتیں داخل ہو گئی تھیں تاہم سجدہ تحیہ تو درکنار مسلمان کسی کے آگے معمولی طور پر سر جھکانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس چیز کا ذکر اگر کہیں ملتا ہے تو مسلمان سلاطین میں سے اکبر کے درباریوں میں ملتا ہے یا پھر تصوف کی ان شاخوں میں ملتا ہے جن میں سنت کے مقابل میں بدعت کا غلبہ رہا ہے۔ اگر کوئی شخص ان کو دلیل کی حیثیت سے پیش کرے تو وہ بلاشبہ سجدہ تحیہ کے جواز بلکہ استحسان تک کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن اس دور کی غلط باتوں کو ایک حجتِ شرعی کی حیثیت سے کوئی نادان ہی پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔

فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے

فلسفۂ دین کے پہلو سے اس مسئلہ پر غور کیجیے تو آپ کے سامنے یہ حقیقت آئے گی کہ اسلام میں صرف صریح شرک ہی حرام نہیں ہے بلکہ وہ ساری چیزیں اور باتیں بھی حرام ہیں جو ذریعۂ شرک یا صورتِ شرک ہیں۔ اگر اسلام کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کے ساتھ ان چیزوں کو بھی حرام ٹھہرا دیتا ہے جو اس حرام کے لیے ذریعہ اور واسطہ بن سکتی ہیں۔ اگر یہ حقیقت آپ تسلیم کرتے ہیں کہ سجدہ تذلل و تعبد کی سب

سے بڑی نشانی ہے تو اس چیز کو غیر اللہ کے لیے اسلام کس طرح جائز رکھ سکتا ہے؟ اگر آپ کہیں کہ غیر اللہ کے لیے سجدہ عبادت نہیں بلکہ سجدہ تحیہ جائز ہے تو سوال یہ ہے کہ سجدہ تحیہ اور سجدہ عبودیت کی صورت میں ظاہری فرق کیا ہے؟ پھر سدِ ذریعہ کے اصول پر اسلام میں یہ کیوں نہ حرام ٹھہرے؟

ضمنی سوالات کا جواب

یہاں تک اصل سوال کے جواب پر گفتگو تھی اور جہاں تک مسئلہ کی تحقیق کا تعلق ہے اس پر اب کچھ مزید لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن مستفسر نے ضمناً بعض اور باتیں بھی ایسی لکھ دی ہیں جن سے ان کے خیال میں سجدہ تحیہ کے جواز کی دلیل فراہم ہوتی ہے۔ ہم مختصراً ان کی حقیقت بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں۔

مسلم الثبوت کے حوالہ سے یہ اصول پیش کیا گیا ہے کہ "اگر ایک شے کا وجوب منسوخ ہو جائے تو اس کا جواز باقی رہتا ہے۔" ہم بغیر کسی بحث کے تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ اصول صحیح ہے لیکن یہاں اس اصول کا حوالہ بالکل بے محل ہے۔ جو آیتیں سجدہ تحیہ کے جواز کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں ان کے منسوخ ہونے کا دعویٰ ہم نہیں کرتے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ دو آیتوں میں سے ایک آیت تو سجدہ تحیہ کی بحث سے بالکل ہی غیر متعلق ہے اور دوسری آیت سے اگر کوئی بات نکلتی ہے تو صرف یہ نکلتی ہے کہ بنی اسرائیل میں سجدہ تحیہ کا رواج تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا یہ چیز اس امت میں بھی جائز ہے تو اس سوال کے جواب کا انحصار اس باب میں کتاب و سنت کی دوسری تصریحات پر ہے۔ اور یہ ہم تفصیل کے ساتھ واضح کر چکے ہیں کہ قرآن، حدیث، امت کا عملی تواتر اور اسلام کا مزاج، یہ ساری چیزیں اس کے خلاف ہیں۔

قاضی خان کے حوالہ سے اس اصول کا ذکر کیا گیا ہے کہ "اصل ہر چیز میں اباحت ہے اگر اس کے خلاف کوئی دلیل موجود نہ ہو۔" ہمیں اس اصول کی صحت سے بھی انکار نہیں ہے لیکن اس کا حوالہ بھی یہاں بالکل بے محل ہے کیونکہ سجدہ کے بارے میں اثباتی طور پر یہ بات موجود ہے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے اور منفی پہلو سے یہ بات موجود ہے کہ غیر اللہ کے لیے کسی نوعیت کا سجدہ بھی جائز نہیں ہے۔

فتاوائے عالمگیری کے حوالے سے امام ابو منصور کا یہ فتویٰ نقل کیا گیا ہے کہ "اگر کوئی شخص کسی کے لیے زمین بوسی کرے یا جھکے یا سر جھکائے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی، کیونکہ اس نے محض اس کی تعظیم کے خیال سے کیا ہے نہ کہ عبادت کے خیال سے۔" اگر امام ابو منصور کا یہ فتویٰ فی الواقع ہے تو ہمیں اس فتویٰ سے اختلاف نہیں ہے۔ محض کسی کے آگے جھک جانا یا سر جھکا دینا کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ اس پر کسی کی تکفیر کر ڈالی جائے۔ اس پر اگر اعتراض کیا جا سکتا ہے تو اس پہلو سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ بات ایک سچے موحد کی شان کے خلاف ہے اور اسلام میں اس قسم کے طریقۂ تعظیم کو پسند نہیں کیا گیا ہے لیکن اس پر تکفیر ہرگز نہیں کی جائے گی۔ سجدۂ تحیہ کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے۔ امام ابو منصور کے اس فتویٰ کا تعلق اس سے ہرگز نہیں ہے۔

ملتقط کے حوالے سے جو قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس کا انتساب حضرت ابن عباس کی طرف میرے نزدیک بالکل غلط ہے۔ یہ بات ان کی طرف کسی مفتری نے منسوب کر دی ہے۔ اول تو تفسیر میں ان کا جو مقام ہے وہی اس کے منافی ہے کہ اس قسم کی کمزور بات ان کی زبان سے نکلے۔ ثانیاً تفسیر کی معتبر کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگلی امتوں میں اس طرح کا سجدہ غیر اللہ کے لیے جائز تھا لیکن اس امت میں سجدہ صرف جناب رب العزت کے لیے خاص ہو گیا ہے۔

"لو کنت آمراً احداً ان یسجد لاحد" اس حدیث سے متعلق عبد الحق محدث دہلوی کی جو تحقیق نقل ہوئی ہے مجھے اس سے بھی اتفاق نہیں ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ یہ بات بجائے خود صحیح ہے لیکن اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ نہ تو یہ نسخ کا محل ہے اور نہ ہم نسخ کا دعویٰ ہی کرتے ہیں۔ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ قرآن سے زیادہ سے زیادہ جو بات نکلتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں اس قسم کے سجدے کا رواج تھا، یہ بات کہ اس امت میں بھی یہ بات جائز ہے تو اس کا فیصلہ قرآن و حدیث کی دوسری تصریحات ہی سے ہو سکتا ہے اور وہ اس کے جواز کے خلاف ہیں۔

دوسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ "لا ینبغی" کے الفاظ سے قطعی نہی نہیں نکلتی۔ چلیے ہم نے مان لیا کہ قطعی نہی اس سے نہیں نکلتی لیکن کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ "لا ینبغی" کے الفاظ جواز و

استحسان کے بیان کرنے کے لیے آیا کرتے ہیں؟ علاوہ ازیں دوسری روایت جس میں حضرت سلمان کا واقعہ بیان ہوا ہے اس میں صاف 'لا تسجد لی یا سلمان واسجد للحی الذی لا یموت' کے الفاظ وارد ہیں۔ کیا ان الفاظ سے بھی قطعی نہی کا ثبوت نہیں ملتا؟

تیسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ یہاں سجدۂ ممنوعہ کی نوعیت نہیں بیان ہوئی ہے بلکہ ایک مطلق لفظ سجدہ کا وارد ہے اور اصول کا مسئلہ یہ ہے کہ جب لفظ مطلق ہو تو اس سے فرد کامل مراد ہوا کرتا ہے۔ محقق دہلوی کا مطلب یہ ہے کہ جب یہاں سجدۂ تحیہ کی تصریح کے بغیر لفظ سجدہ آیا ہے تو اس سے مراد صرف سجدۂ عبادت ہی ہو گا نہ کہ سجدۂ تحیہ۔

میرے نزدیک یہ اصول بالکل غلط ہے اور اگر قرآن و حدیث میں اس اصول کا بے محابا استعمال شروع ہو جائے تو سارا دین بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ میں حدیث و قرآن سے سینکڑوں مثالیں ایسی پیش کر سکتا ہوں کہ ایک لفظ مطلق استعمال ہوا ہے اور وہ اپنے بالکل ابتدائی یا ظاہری معنی پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح وہی لفظ دوسری جگہ استعمال ہوا ہے اور وہ اپنے انتہائی یا دوسرے الفاظ میں کامل یا حقیقی معنی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ مقام اس مسئلہ پر بحث کے لیے موزوں نہیں ہے لیکن اگر کوئی صاحب "المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل" کو ایک قطعی فارمولے کی حیثیت سے پیش کرنے اور اس کی صحت پر مصر ہوں تو میں اس کی غلطی ہر میدان میں ثابت کرنے کے لیے انشاء اللہ حاضر ہوں۔

آخر میں مستفسر نے سجدۂ تحیہ کے جواز میں حضرت نظام الدین اولیاء کی بعض کتابوں اور مولانا روم کی مثنوی کا حوالہ دیا ہے۔ میں ان بزرگوں کی حد درجہ عزت کرتا ہوں اور یہ حسن ظن رکھتا ہوں کہ انھوں نے اس قسم کی کوئی غلط بات اپنی کسی کتاب میں نہیں لکھی ہو گی لیکن اگر خدانخواستہ انھوں نے یہ بات کہیں لکھی ہے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کی اس لغزش کو معاف فرمائے اور تمام طالبین حق کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ یہ مسئلہ کتاب و سنت سے معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

ماخوذ از ترجمان القرآن، جون ۱۹۵۱ء

عزیزالدین عزیز بلگامی

عزیز بگھروی "جہادِ حرف" کا مجاہد

جناب عزیز بگھروی کا نام ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں غیر معروف نہیں ہے۔ آپ طویل عرصہ سے برصغیر ہندوپاک کے مقبول رسالوں اور اخباروں میں اہتمام کے ساتھ چھپتے رہے ہیں۔ مشاعروں میں کلام پڑھنے کا آپ کا ایک مخصوص انداز ہے جس کی وجہ سے بھی آپ کو ادبی حلقوں میں شہرت حاصل ہے۔ پھر آپ ادارۂ ادب اسلامی ہند کی مرکزی مجلس عاملہ کے رکن بھی ہیں۔ اور ادھر کچھ مہینوں سے تحریک ادب اسلامی کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں تو اس میں عزیز صاحب کا اہم رول رہا ہے۔ بلکہ اس وقت ہندوستان میں ادارۂ ادب اسلامی کے آپ روحِ رواں ہیں۔ سال ۱۹۸۶ء کے آخر میں آپ کا مجموعۂ کلام جہادِ حرف کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ ادارۂ ادب اسلامی ہند نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اس کی اشاعت کی ہے۔ انتخاب و ترتیب جناب انتظار نعیم صاحب کی ہے جو ادارۂ ادب اسلامی ہند کے جنرل سکریٹری ہیں۔ خوبصورت آرٹ پیپر پر سہ رنگی طباعت نے "جہادِ حرف" کو نہ صرف معنوی خوبصورتی بخشی ہے بلکہ اس کی صوری خوبصورتی میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے۔ کتابت اور جلد معیاری ہے۔ اس قدر خوبصورت مجموعۂ کلام کی قیمت صرف -/25 روپے ہے چنانچہ توقع یہی ہے کہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچے گی۔ کیونکہ عام مجموعہ ہائے کلام کے مقابلہ میں اس کی قیمت بہرحال زیادہ نہیں۔ مرکزی مکتبہ اسلامی بازار چتلی قبر دہلی ۶...۱۱ (انڈیا) سے اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ادارۂ ادب اسلامی ہند کی برپا کردہ ادبی تحریک کے قائد کے کلام پر اظہارِ خیال (تبصرہ نہیں) مجھ جیسے بے بضاعت آدمی کا کام ہرگز نہیں تھا لیکن مدت سے یہ بات دیکھی جارہی ہے کہ فن کی ناقدری روزافزوں ہے۔ خود عزیز بگھروی اس صورتحال سے نالاں ہیں،

عزیز اب کیا کہیں ناقدریٔ فن کا یہ عالم ہے
اٹھا کر رکھ دئے سب نے قلم آہستہ آہستہ

اگر قلم سے بیزاری کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا تو ظاہر ہے ہم جیسے مدّاحانِ عزیز بگھروی ہی کو قلم اٹھانا پڑے گا اور خود ان ہی کے پرِ ظرف پر قلم زنی کی جرأت (بلکہ گستاخی) کرنی پڑے گی۔

عزیز صاحب کی باغ و بہار شخصیت سے احقر کے تعلقات یہی کوئی چھ، سات سال پرانے ہیں اور اس دوران خط و کتابت کا سلسلہ بھی ہمارے درمیان جاری رہا ہے۔ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ مشاعروں میں جب بھی انہیں فرصت کے لمحات میسر آتے ہیں مختلف موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ وہ کچھ اس انداز سے شروع فرماتے ہیں کہ وہ بس کہتے جاتے ہیں اور ہم سنتے جاتے ہیں اور جب کہنا شروع کرتے ہیں تو کہنے کے لئے پھر ہمارے پاس کچھ باقی نہیں رہتا۔ اتنی بات مگر ضرور ہے کہ آپ کی مختصر سی شخصیت کا تاثر ذہن و قلب پر کچھ ایسا مترتب ہوتا ہے کہ انہیں بھلانے کی دانستہ، نادانستہ کسی طرح کی بھی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتی۔ ایک پست قدوالی مختصر سی شخصیت اپنے اندر کیسے کیسے طوفان رکھتی ہے اس کا اندازہ "جہادِ حرف" میں مندرج غزلوں سے بخوبی ہوگا۔

مجموعۂ کلام کا نام کچھ اس قدر جاذبِ نظر ہے کہ پہلی فرصت میں نظریں نام ہی پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ جب میں نے اس بات پر غور کیا کہ مصنف کو یہی نام کیوں سوجھا ہوگا۔ تو کچھ ہی دیر میں کچھ نکات ذہن کے افق پر نمودار ہوئے

اور بعد میں یہ بات مجھ پر واضح ہو گئی کہ مصنف نے اپنے کلام کی مناسبت سے بالکل موزوں اور مناسب نام اپنے مجموعۂ کلام کے لئے تجویز کیا ہے۔ جب میں نے جائزہ لیا تو دیکھا کہ جہاد سے متعلق الفاظ "دشمن" "تیغ" "تیر" "خنجر" "تیزہ" "زخم" "قتل" "مقتول" "قیدخانہ" "زنداں" "استبداد" "صلیب" "طوق و سلاسل" "دار و رسن" "کربلا" "شہادت" وغیرہ تقریباً ۱۰۹ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ حالانکہ مجموعۂ کلام میں غزلیات کی تعداد صرف ۶۷ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کتاب میں جہاد سے متعلق اس قدر زیادہ الفاظ کا استعمال ہوا ہو اس کا نام "جہادِ حرف" ہی ہونا چاہیئے، کیونکہ الفاظ بھی حروف ہی سے مل کر بنتے ہیں۔ لیکن یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ عزیز بگھروی صاحب نے ان الفاظ کو استعمال کر کے قتل و خون کی تلقین فرمائی ہے یا "جہاد" کے موضوع پر کوئی شعری کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ خود عزیز صاحب نے اپنی پوزیشن اس طرح واضح فرمائی ہے۔

انسانیت کا قتل گوارہ نہیں ہمیں
ہم فرقِ رنگ و نسل و وطن کے خلاف ہیں

بلکہ ان کی انسانیت دوستی کا اندازہ اس شعر سے لگایئے:

ظلم والوں کے مکاں ہوں کہ وہ مظلوموں کے
ہم سے بستی کے جلتے گھر نہیں دیکھے جاتے

واقعہ یہ ہے کہ عزیز صاحب دلوں سے دلوں کو جوڑنے کی بات کرتے ہیں — کدورت، تفریق اور انسان سے انسان کی دوری پر آپ بڑے دکھی نظر آتے ہیں۔ اس وقت عالمِ انسانی ایک اجڑے کاشانے کی مانند ہے چنانچہ آپ کا یہ عزم ہے کہ اس اجڑے ہوئے کاشانے کو پھر آباد کیا جائے، چنانچہ اپنے ترانے میں آپ فرماتے ہیں۔

ذہنوں سے ہر اک نقشِ کدورت کو مٹا کر

نفرت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھا کر   دم لیں گے ہم انسان کو انساں سے ملا کر
آباد پھر اجڑا ہوا کاشانہ کریں گے
مر جائیں گے ایمان کا سودا نہ کریں گے

آپ دلوں میں اختلاف کی خلیج کو بڑھانے والے تمام عوامل کا قلع قمع کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک عمل یہ ہے کہ تیغ کو بزورِ استعمال کیا جائے مسائل کو نپٹانے کے لئے۔ لیکن ہو سکتا ہے۔ وقتی طور پر مسئلہ حل ہو جائے لیکن یہ حل دیرپا اس لئے ثابت نہیں ہوتا کہ دلوں میں تیغ کے بزورِ استعمال کی وجہ سے خلیج بڑھ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

دلوں میں اختلاف کی خلیج اور بڑھ گئی
بزورِ تیغ مسئلہ نپٹ گیا تو کیا ہوا

یہ ضرور ہے کہ عزیز بگھروی نے اپنی بات کو انقلابی انداز میں پیش کرنے کیلئے جہاد کے انقلابی پیرایۂ اظہار کا سہارا لیا ہے۔ ورنہ ان کے اشعار اور فن کے پیرایۂ اظہار کے پیچھے ایک حساس دل ہے جو انسان کی زبوں حالی پر تڑپتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں آفاقیت پائی جاتی ہے اور انسان کو بحیثیت انسان اپیل کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ یہ وہ عناصر ہیں جو بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ میرا موضوع اس وقت یہی ہے کہ عزیز صاحب اپنے دامنِ شعر و سخن میں انسانیت کو درپیش مسائل کو حل کرنے کی کون سی تجاویز رکھتے ہیں۔ لیکن اپنے موضوع پر آنے سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ان کے شعری مسلک کا تعین خود ان کے کلام سے، ابتدا ہی میں کر دیا جائے تاکہ بعد کی بحثوں کو پڑھتے وقت ذہنوں میں کسی قسم کی الجھن باقی نہ رہے یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ جو شخص ایک ملک گیر ادبی تحریک کے قائدین میں سے ہو اور جس کی موجودگی میں تحریکِ ادبِ اسلامی کی پالیسی بنتی ہو۔ اس کا شعری مسلک واضح ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کچھ معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

اولاً۔ آپ سخن برائے سخن یا بالفاظِ دیگر ادب برائے ادب کے مخالف ہیں لیکن بذاتِ خود فکر اور فن کے خلاف ہرگز نہیں۔ فرماتے ہیں۔

ہم فکر کے خلاف نہ فن کے خلاف ہیں
ہم تو سخن برائے سخن کے خلاف ہیں

ثانیاً۔ آپ لفظوں کی بازیگری کے لئے شعر کہنے کو غلط سمجھتے ہیں:

شعر کہنا عزیزؔ اپنے بس کا نہیں
صرف لفظوں کی بازیگری کے لئے

ثالثاً۔ آپ لوح و قلم کا اعتبار قائم کرنے کے لئے شعور کی پختگی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اسی پختہ شعور کی بدولت نگاہِ معتبر کی تخلیق ہوتی ہے اور یہی شے ہے جس سے اعتبار لوح و قلم کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

ناپختہ ہے شعور تو نامعتبر نگاہ
اب اعتبارِ لوح و قلم کا سوال کیا

رابعاً۔ آپ فنی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ لفظ و معنی کا پاس و لحاظ رکھنے کو ضروری سمجھتے ہیں تاکہ گنجلک اظہارِ بیان سے اردو زبان کے وقار کو نقصان پہنچنے نہ پائے۔

لفظ و معنی کا پاس رکھیے عزیزؔ
آپ اردو زبان والے ہیں

خامساً۔ آپ فنکاروں کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ ظلم پر خاموشی اختیار نہ کریں بلکہ ظالموں کے ظلم پر برابر تبصرہ کریں۔ مرنے والوں پر صرف مرثیہ ہی لکھنے کے عادی نہ بن جائیں بلکہ اپنے اندر قاتلوں کے قتل پہ تبصرہ کی جرأت بھی پیدا کریں۔ اس سے ایک ایسی فضا بنے گی جہاں ظالم خود بخود ظلم سے ہاتھ کھینچنا شروع کریگا۔

مرنے والوں پہ لکھے گئے مرثیے
قاتلوں پر کوئی تبصرہ بھی نہیں

سادساً۔ آپ کا نظریہ ہے کہ ہجو تلخ سہی خلوص سے خالی نہ ہو کیونکہ خلوص ہی

کی وجہ سے حروف کو یہ اعجاز حاصل ہوتا ہے کہ وہ دل میں اتر جاتے ہیں۔

لہجہ کی تلخیوں میں سمویا ہوا خلوص
اعجازِ حرف تھا کہ دلوں میں اتر گیا

گویا آپ اس سلسلہ میں جناب حفیظؔ میرٹھی کے ہم مسلک ہیں جنہوں نے فرمایا ہے۔

اثر ہوا ہے تو تقریر کا کمال نہیں
مرا خلوص مخاطب تھا میں کہاں بولا

آخری اور اہم دفعہ یہ ہے کہ آپ دل کو — جو افکار و نظریات کا حقیقی منبع ہے — انبیاء کرام کا ورثہ تصور کرتے ہیں اور اسے خدا کی امانت سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے فنکار اگر اپنے منبع فکر و نظر — یعنی دل — کو انبیاء کرام کا ورثہ اور امانتِ خداوندی سمجھنے لگے تو یہیں سے مادہ پرست فن اور خدا پرست فن ایک دوسرے سے الگ ہوکر دو مختلف منزلوں کی طرف مڑ جاتے ہیں — راستے مختلف تو منزلیں بھی مختلف ہونگی چنانچہ ایک کی منزل فلاحِ آخرت ہوگی تو دوسرے کی خسرانِ آخرت۔

ورثہ ہے یہ نبیوں کا امانت ہے خدا کی
جاں ہارنے والو دلِ خود دار نہ بیچو

اس مرحلے پر جناب نعیم صدیقی صاحب کا یہ اقتباس نہایت برمحل سمجھا جائے گا، اس میں بڑی حد تک عزیزؔ صاحب کے مسلکِ شعری کی وضاحت ہوگئی ہے:

"وہ زندگی کے معرکہ ہائے کشاکش سے گزرے، انہوں نے غمِ جاں، غمِ جاناں، غمِ انساں اور غمِ ایماں سب کا تجزیہ کر لیا۔ ان کی شاعری میں یہ سارے غم جھلکتے ہیں مگر غمِ ایماں جو سارے غموں کا درماں ہے، وہ عزیزؔ صاحب کے یہاں روحِ سخن بن گیا ہے۔ مگر کمال یہ کہ شعر کہتے ہوئے وہ مذہبی تبلیغ کی راہ پر نہیں پڑے بلکہ شاعرانہ آبگینہ تراشیوں کے نازک فن کو انہوں نے ایسے طریق سے برتا کہ وہ قدریں روشن ہوگئیں

تھیں۔ جو خدا پرستانہ تہذیب کی قدریں ہیں سارے نبیوںؑ نے ان کی آبیاری کی ہے۔ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ چاند ستاروں کی طرح جگمگا اٹھیں۔ یہی قدریں تباہ کار قوتوں کے مقابلے میں انسانیت کے لئے آخری سرمایۂ تحفظ بنیں گی۔"

اس مختصر سی تمہید کے بعد آیئے جائزہ لیں کہ عزیزؔ صاحب نے کن کن قدروں کو روشن کیا ہے۔ اور یہ کہ انسانیت کو درپیش مسائل کے حل کرنے کے سلسلے میں انہوں نے کیا تجاویز پیش کی ہیں۔

عزیزؔ صاحب کی نظر میں اس وقت عالم انسانی کا مسئلہ، امت مسلمہ کا افتراق ہے۔ کیونکہ سارے عالم کی رہبری کے لئے امت مسلمہ کو برپا کیا گیا تھا۔ چونکہ اس وقت یہ ملت تفرقہ میں مبتلا ہے اور ان کی باہمی لڑائی کی وجہ سے رہبری کا منصب آپ سے آپ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔ نتیجۃً دنیا پر خدا فراموش گروہوں کا قبضہ ہے اور انسانیت ہر قسم کی ناانصافی کا شکار ہے اور فساد فی الارض کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے ؎

عالم کی رہبری کو اٹھائے گئے تھے ہم
تفریقِ باہمی کے سبب رہ گئے کہاں

اس تفریقِ باہمی کو مٹانے کے لئے بقول عزیزؔ، بیرونی تحرک کسی کام کا نہیں۔ اس کا جذبہ ملت کے اندر پیدا ہونا ضروری ہے اور اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کا فیصلہ خود اسے کرنا ہے ؎

مل کے رہنے کا ہم فیصلہ تو کریں
کس میں ہمت ہے ہم میں جدائی کرے

پھر آپ ملتِ اسلامیہ کو کچھ اس انداز سے تلقین فرماتے ہیں ؎

آپس کی کشمکش میں ادھر مبتلا ہو تم
میدانِ زندگی میں ادھر صف بصف کوئی

پھر تفرقہ کو حبِ رسولؐ کے حوالے سے ختم کرنے کی ایک نادر تجویز پیش کر کے علامہ اقبالؒ کی یاد ذہنوں میں تازہ کرتے ہیں ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

عزیزؔ کا استعجاب ملاحظہ فرمایئے ؎

ہم میں پھر تفریق کیسی، اجنبیت کس لئے
میں بھی شیدائے محمدؐ، تو بھی شیدائے رسولؐ

یعنی آپ نے حبِ رسولؐ کو اتحادِ ملت کی بنیاد ٹھہرایا۔ یعنی ساری ملت اسلامیہ محمدؐ کی شیدا ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے تو یہی قدرِ مشترک کیا کم ہے کہ جس بنیاد پر یہ تفرقہ مٹا ڈالا جائے اور یہ ملت باہم متحد ہو کر محمدؐ سے وفا کا ثبوت پیش کرے۔

پھر دوسرا مسئلہ عالم انسانی کو درپیش ہے وہ یہ کہ ظلم کی تائید پر لوگ گویا متفق ہو گئے ہیں اور مظلومیت بے یار و مددگار ہو کر اپنے ہمدردوں کو ڈھونڈھ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں عزیزؔ صاحب مسلسل ضمیروں پر اپنے انقلابی شعروں کے ذریعہ ضرب لگاتے جاتے ہیں اور کسی طرح کی مصالحت پر آمادہ نظر نہیں آتے ؎

ہمت نہ ہو تو چھین لو دستِ جفا سے تیغ
اہلِ ستم سے رحم و کرم کا سوال کیا

یہاں تک کہ چپ رہنے کو بھی آپ ظلم کی تائید کا نام دیتے ہیں ؎

چپ رہنا تو ہے ظلم کی تائید میں شامل
حق بات کہو، جرأتِ اظہار نہ بیچو

بے باکی ملاحظہ فرمایئے ؎

کٹ جائے سر بلا سے جھکایا نہ جائے گا
ظالم کو بے گناہ تو سمجھا نہ جائے گا

پھر تیسرا مسئلہ جو آج نوعِ انسانی کو بالعموم اور امتِ مسلمہ کو بالخصوص پریشانی میں مبتلا کئے ہوئے ہے وہ قول و عمل کے تضاد کا مسئلہ ہے جو اپنے مضرات کے اعتبار سے انسانیت کے لئے بڑا تباہ کن ہے۔ ساری انسانی آبادی پر اس کے تمام طبقوں، گروہوں، قوموں کے ساتھ، ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک بدترین قسم کا تضاد قول و عمل میں ہے جو ساری انسانی آبادی کو اپنے اثر میں لئے ہوئے ہے۔ دل میں کچھ ہے تو زبان پر کچھ، دل میں اگر نفرت ہے تو زبان پر شیر و شکر والے الفاظ، دل کسی کے لئے ہے تو سر کسی کے لئے خم ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس منافقانہ زندگی کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

سوچو تو ہر اک دل میں ہے نفرت بکھرا ہے
دیکھو تو ہر اک شخص بہم شیر و شکر ہے

اور

دل میں کچھ اور زبانوں پہ کچھ اور عزیزؔ
اس روایت کو زمانے سے مٹایا جائے

اور

دل کسی کے لئے سر کسی کے لئے
بدنما داغ ہے زندگی کے لئے

چنانچہ بزدلوں سے دو ٹوک انداز میں سوال کرتے ہیں ؎

سرفرازی کی یہ بات کرتے ہو کیوں
سر کٹانے کا جب حوصلہ بھی نہیں

چوتھا مسئلہ ہے ریاکاری کا جس سے خصوصیت کے ساتھ ہمارا طبقہ زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ صرف ظاہری شان و شوکت پر نظر رکھنے کا رجحان عام ہے۔ صرف چہروں پہ زمانے کی نظر ہوتی ہے اور کسی شخص کی صلاحیت پر بہت کم نظر ہوتی ہے۔ چنانچہ عزیزؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

اب فقط چہروں پہ رہتی ہے زمانے کی نظر
اب کسی شخص کے جوہر نہیں دیکھے جاتے

اس عہدِ ریاکار سے اللہ بچائے
اب خود سے بھی ملتے ہیں تو ہم سوچ سمجھ کے

اب ان چار بیماریوں پر غور فرمائیے تو احساس ہوگا کہ ان سے شفایابی حاصل کرنے پر عالمِ انسانی کے سکون و چین کا کس قدر انحصار ہے۔ افتراقِ ملت کی بیماری، ظلم کے سلسلہ میں انسانوں کا منفی رویہ یعنی تائیدِ ظلم کی بیماری، قول و عمل کے تضاد کی بیماری اور ریاکاری کی بیماری۔ واقعہ یہ ہے کہ کیا دیر، کیا حرم سارا عالم ہی متاثر نظر آتا ہے ؎

ہیں زد میں آندھیوں کی ہر اک بزم کے چراغ
فانوسِ دیر و شمعِ حرم کا سوال ــــــ کیا

حضرت عزیزؔ ان مسائل کے سدِباب کے لئے بڑی احتیاط سے قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ اہلِ کارواں کا شعورِ منزل جاگے۔ جب ایسا ہوگا تو ہر راہرو میں رہنمایانہ خصوصیات پیدا ہوں گی۔

شعور جاگا ہے منزل کا اس طرح یارو
ہر اک رہروِ منزل ہے رہنما کی طرح

ان عالمگیر بیماریوں کا سدِباب کرنے والی تحریک کے قافلے میں صرف ان ہی افراد کی شمولیت کے حق میں عزیزؔ صاحب فیصلہ صادر فرماتے ہیں جو ایثار و قربانی کے معاملہ میں بڑے فراخ دل و وسیع ہوتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس قافلے کے راہرو کو شریکِ کارواں ہوتے وقت یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ شریکِ سفر ہونے کے لئے شرائط پیش کرنے لگے۔ بلکہ اس کا حال تو "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق" کے مصداق ہونا چاہیئے۔ شرائط کے ساتھ عزمِ سفر بے سود ہے اور ایسا عازمِ سفر کسی کام کا نہیں ؎

شرط کے ساتھ جو ہو شریکِ سفر
ہمسفر وہ کسی کام کا بھی نہیں

بلکہ ایسا ہمسفر الٹا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اور تہمت، الزام اور دو جانے کن کن چیزوں کی آڑ لے کر اپنی کمزوریوں کو چھپانا شروع کرتا ہے۔ اس وقت مجھے حفیظ میرٹھی کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو موقع کی مناسبت سے بالکل برمحل ہے:

اب اہلِ کارواں پہ لگاتا ہے تہمتیں
وہ ہمسفر جو چلے بہانے میں رہ گیا

اسی طرح کے لوگوں کو ذہن میں رکھ کر ہی عزیزؔ صاحب نے دو ٹوک انداز میں اپنا مافی الضمیر واضح کر دیا ہے اور علامہ اقبال کی فکر سے اپنی فکر کو بہت قریب کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سر لے کے ہتھیلی پہ عزیزؔ آئیں یہاں لوگ
یہ راہِ عزیمت ہے شہادت کا سفر ہے

اور علامہ اقبال کے ساتھ فکری ہم آہنگی اس طرح کہ:

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

آپ ان عالمگیر برائیوں کو ختم کرنے کے لئے تنظیم اور منظم جدوجہد کے ساتھ ربطِ باہم کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فسادیوں کی مربوط جدوجہد سے تعمیر کا کام انجام دینا ہے تو تعمیر پسندوں کے انتشار سے کام نہیں چلے گا۔ ان میں ربطِ باہم اور ربطِ مسلسل ضروری ہے۔ منظم جدوجہد کے بغیر اتنا بڑا جہاد کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس شعر میں آپ نے اسی کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے

خار تو سارے آپس میں مربوط تھے
پھول سے پھول کا کوئی رشتہ نہ تھا

آپ (عزیزؔ بگھروی) چاہتے ہیں کہ یہ گروہ نہ صرف منظم ہو بلکہ یقین،

خود اعتمادی، اور کردار کی دولت سے مالا مال ہو۔ یقین و خود اعتمادی کے بطن سے کردار کا جنم ہوتا ہے۔ اور خود اعتمادی اور یقین کی دولت اسی وقت میسر آتی ہے جبکہ اس تنظیم کا کارکن برسرِحق ہونے کے حقیقی نظریہ سے واقف ہو جائے۔ عزیزؔ صاحب کی نظر میں برسرِحق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ باطل حق کو برداشت نہ کرے بلکہ اس کے لئے دار و رسن کے منظر سجائے کیونکہ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اب عزیزؔ کے ان دو شعروں پر قارئین ایک ساتھ غور فرمائیں تو یہی صورتحال سامنے آئیگی:

حرفِ حق آج بھی ہے اہلِ وفا کے لب پر
آج وہ دار و رسن پہ نہیں دیکھے جاتے

میرا قاتل مرا اپنا کردار ہے
کس کو الزام دوں خودکشی کیلئے

یہ ہے امنِ عالم کا وہ پروگرام جسے حضرت عزیزؔ بگھروی نے پیش فرمایا ہے۔ جب اس پروگرام کو روبہ عمل لایا جائے گا تو جہادِ حرف جہادِ حقیقی میں تبدیل ہوتا نظر آئے گا۔ اور ایک ایسا منظر آنکھوں کے سامنے رقص کرتا ہوا دکھائی دے گا جہاں مجاہدین ایک آواز ہو کر یہ نغمہ الاپ رہے ہوں گے

مقتل سجاؤ تم کہ صلیبیں کھڑی کرو
یہ انقلاب وقت سے رکا نہ جائیگا

کیونکہ

مٹا سکے نہ زمانے کے حادثات مجھے
کھڑا ہوں اپنی جگہ پر ہمالیہ کی طرح

حادثوں کے بارے میں عزیزؔ صاحب کا نظریہ کس قدر ایمان افروز ہے:

میں تو سمجھا تھا مٹا ڈالیں گے یہ برباد دہر
حادثوں نے بخش دی اک عمرِ لافانی مجھے

حادثوں سے عمرِ لافانی حاصل کرنے والا "شاعرِ جہادِ حرف" جس یقین کی دولت سے مالا مال ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے ہر چیلنج کا مقابلہ کرے۔ خوبصورت شعر دے۔

زمانہ تجھ کو مٹانے کی کھا چکا ہے قسم
مرے یقین بتا تیرا کیا ارادہ ہے

بالآخر اس پروگرام امن و عالم کو پیش کرنے کے بعد وہ ساری انسانیت کو توحید کے آستانے پر لا ڈالتے ہیں۔ اگر نعیم صدیقی نے انہیں "شاعرِ توحید" کے لقب سے ملقب کیا ہے تو کہاں غلط کیا ہے۔ نعیم صاحب فرماتے ہیں:

"میرے علم کے مطابق دنیا کے پاس سب سے بڑی سچائی اور سب سے بڑی قدر "توحید" تھی اور "توحید" ہے اور اپنے کلام میں اس توحید کو عزیز صاحب نے اس طرح ابھارا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ انہیں "شاعرِ توحید" کہوں۔"

حقیقت یہ ہے کہ ایک خدا کی چوکھٹ پر جبیں سائی کیا ترک کر دی گئی کہ پیشانی در بدر ہو گئی اور ہر آستانے پر خم ہوتی رہی

چھوڑ کر اس آستاں کو یہ ملی مجھ کو سزا
در بدر کرنی پڑی خم اپنی پیشانی مجھے

کیونکہ

پھر نہیں ہوتی پذیرائی کہیں اس کی عزیز
ان کے در سے اٹھ کے ہو جاتا ہے سر نامعتبر

میں نعیم صدیقی صاحب کے اس خیال سے سو فی صد متفق ہوں کہ عزیز صاحب کی شاعری اپنی لطافتوں کے باوجود ایک مجاہدانہ ضربِ کاری بھی ہے ظلمت کی قوتوں کے خلاف!

مجھے ڈر ہے کہ کہیں عزیز صاحب مجھ پر یہ طنز نہ فرمادیں:

منہ پر تعریف اور پیچھے برائی کرے
بھنا بھی لگائی بجھائی کرے

اس طنز سے بچنے کے لئے کچھ برائی سامنے کر لی جائے تو یہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ بعض باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ کچھ شعر ایسے بھی مجموعۂ کلام میں شامل ہو گئے جنہیں میرے خیال میں "جہادِ حرف" کے شایانِ شان نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ ایسے شعر بہت زیادہ ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ روا داری کے عالم میں شاملِ اشاعت کر دیئے گئے ہیں مثلاً

بات ہو غالب و اقبال کے انداز کی بات
میر کا طرزِ بیاں ہو تو غزل ہوتی ہے

صرف انداز اور طرزِ بیاں سے غزل کہاں ہوتی ہے؟ اس کے لئے تو "معروف اخلاقی قدروں سے تعلق ضروری ہے۔ خود عزیز مجھوروی کے بارے میں حفیظ صاحب نے کتنی سچی بات کہی ہے:

"جہادِ حرف" کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تحریکی اور نظریاتی ہونے کے باوجود سطحی، وقتی اور صحافتی نہیں ہے، معروف اخلاقی قدروں سے متعلق ہونے کے باعث اس کے اشعار اپنی تفہیم اور تاثیر کیلئے اس کے محتاج نہیں ہیں کہ پہلے کوئی ان کا پس منظر بیان کرے۔"

اس شعر کو دیکھئے:

سکونِ دل جو ملا گوشۂ قفس میں عزیز
کھلی فضا سے پرندوں کی رغبتیں بھی گئیں

گوشۂ قفس کا سکونِ دل سے تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر گوشۂ قفس، سکونِ قلب کی آماجگاہ بن جائے تو کون کھلی فضا سے رغبتیں رکھے گا۔

دوسری بات یہ کہ انتظار نعیم صاحب نے مجموعۂ کلام کی ترتیب، انتخاب اور تزئین تو فرمادی (جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں) لیکن پورے مجموعۂ کلام میں ایک پراسرار خاموشی اختیار فرمالی۔ حالانکہ وہ چاہتے تو ایک اچھے فنکار ہونے کے ناطے اور ادارۂ ادب اسلامی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے، پورے اہتمام کے ساتھ شائع ہونے والے اس پہلے مجموعۂ کلام کے ذریعہ اپنی بات ادبی حلقوں میں بطور ایک دفتری اعلان کے (Official Declaration) پیش فرماتے۔ اس لئے کہ اس وقت اسلامی ادبی تحریک پر زمانے کی بڑی نظریں ہیں۔ چنانچہ یہ مجموعۂ کلام ادارۂ ادب اسلامی ہند کے زیر اہتمام چھپنے کے باوجود بھی ادارۂ ادب اسلامی کا نہیں لگتا، جب تک کہ اس کو پڑھ نہ لیا جائے۔

تیسری بات یہ کہ اس کی ترتیب میں اگر یہ لحاظ رکھا جاتا تو اچھا ہوتا۔

"نعت"، "غزلیں"، "ترانہ"۔

بہرحال یہ دو تین باتیں اہم نہ ہونے کے باوجود بھی اہم ہیں، اس لئے بڑے ادب و احترام کے ساتھ جناب عزیز بگھروی اور جناب انتظار نعیم صاحب کی خدمت میں ہم نے پیش کی ہیں۔

بہرکیف مجموعۂ کلام جاندار ہے۔ خدا کرے ملت کے اس وفا شعار شاعر جہادِ حرف کی باتیں پیغام بن کر ساری دنیا میں پھیل جائیں۔ ا۔ حنیف۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے اور جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہو تو اپنی زبان سے فحش بات نہ نکالے اور نہ شور و ہنگامہ کرے، اور اگر کوئی اس سے گالی گلوج کرے یا لڑائی کرنے پر آمادہ ہو تو اس روزہ دار کو سوچنا اور یاد کرنا چاہئے کہ میں تو روزہ دار ہوں (بھلا) میں کس طرح گالی دے سکتا اور لڑ سکتا ہوں۔ (بخاری، مسلم)

نورالہدیٰ نور قاسمی، جونپوری

تاریخ اردو کا ایک مختصر خاکہ

اردو زبان کی ابتدا کب ہوئی اور کہاں ہوئی۔ اختلاف اقوال کے باعث اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ بعض لوگوں نے عین الدین گنج العلم کے رسالوں کو اردو کی قدیم ترین تصنیفات کہا لیکن ممکن ہے یہ بات صحیح نہ ہو، اس لئے کہ عین الدین گنج العلم کی پیدائش ۷۰۶ھ میں ہوئی ہے۔ اور بعد میں دو ایک کتابیں ایسی دریافت ہوئیں جو ۸۰۰ ہجری کے قریب زمانہ میں لکھی گئیں، تاریخ کے مختلف تجربے ہوئے اور اوراق کو دیکھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو نثر کی بنیاد سب سے پہلے دکن میں تعلیم و تبلیغ کی خاطر رکھی گئی۔ اور شمالی ہند میں سب سے پہلے اردو نثر کے موجد مولانا فضلی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دور اول کی تمام تصنیفات مذہبی حکایتوں سے پر ہیں۔

ابھی اردو ایک تڑپتے ہوئے شیر خوار بچے کی طرح کسی ایسی ذات مشفق کی محتاج تھی جو اس کی تشنگی کو بجھا سکے کہ میر امن نے سب سے پہلے باغ و بہار اور میر بھی سادہ اردو نثر لکھ کر ایک نئی جان پیدا کر دی اور انہیں معاصروں میں حیدر بخش حیدری اور حسینی وغیرہ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اردو کا یہ دور دکن کی ابتدائی خدمات سے گزر کر کلکتے کے فورٹ ولیم کالج تک پہنچتا ہے۔

اردو نثر کا دوسرا دور اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر سے شروع ہوتا ہے جس کی بنیاد گلکرائسٹ (جو اس وقت کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل تھے) کے ہاتھوں سے رکھی گئی۔ لیکن ابھی تک اس کی پرواز تخیل کے بام عروج پر پہنچنے سے قاصر تھی کہ یکایک مطلع صبح کی کرنیں توانائی کا جام لے کر آگے بڑھیں، اور نسیم صبح کی دلفریبی سے لطف اٹھاتی ہوئی گرتی پڑتی دور نشاط کے دروازے پر پہنچیں

کو کافی ترقی دی۔ اس کے بعد کانپور سے زمانہ، الہ آباد سے ادیب، علی گڑھ سے انجمن معلی کے ماہنامہ اور رسالے بڑے طمطراق کے ساتھ نکلنا شروع ہوئے اور پھر اخباروں کا ایک سلسلہ جاری ہوگیا جسمیں مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار الہلال تو ایسا ذکر ہے جو اردو کی تاریخ میں ثبت ہے، ایک روشن ترین باب ہے۔

یہ دور جاری رہا یہاں تک کہ عثمانیہ یونیورسٹی، انجمن ترقی اردو، دارالمصنفین اور پنجاب کی ادبی سرگرمیوں سے اردو نثر کے پانچویں دور کی تعمیر ہوئی جس نے اردو کو اصلاحی طرز سے میدان میں لا کھڑا کیا جس کی بے انتہا کوششوں کے نتیجے میں آج تک یہ دور جاری ہے۔ جس نے ہندوستان کے طول و عرض پر پھیلے ہوئے دامن میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کی مسوا تحریری اور ان کی داستانوں وحکایات کو سمیٹ لیا ہے جس پر صرف ہمیں ہی نہیں بلکہ تمام اردو دانوں کو فخر ہے، اور کیوں نہ ہو؟ جبکہ تاریخی معلومات کا ذخیرہ اسی کے دامن میں پوشیدہ ہو جس کے حاصل کرنے کے لئے ہر انسان اس کی عقدہ کشائی میں مصروف ہو۔

بقیہ :- فتح الرحمان ایک تنقیدی مطالعہ

دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے اصول وضوابط پر المقدمہ فی القوانین الترجمہ مرتب کی۔ اگر ان تمام تصانیف کو سامنے رکھ کر شاہ صاحب کے کارنامہ کی قدر و قیمت متعین کی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآن کریم کے خادم علماء کے صدر نشین نظر آتے ہیں۔

اس کی بنیاد بھی کو دور کرنے میں مرزا غالب کے ان خطوط سے کافی مدد ملی جو بعد میں "اردوئے معلی" کے نام سے شائع ہوئے غالب کی نثر کے ساتھ ہی ساتھ اردو کو سنوارنے میں ان کی نظم کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ ہم اردو کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو لوگ غالب کی نظم کو نعیمانہ کا درجہ قرار دیتے ہیں۔ یہ خود ان کا ایک احمقانہ خیال ہے کیونکہ ہر زمانے کا ایک خاص ذہن اور اس کی اپنی ایک خاص زبان ہوتی ہے جس کے تحت انسان اپنے دل کی آواز کو الفاظ و معانی کا جامہ پہنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کے ان احوال و اقوال کو اسی کے زمانہ کے ذوق کے مطابق اگر دیکھا جائے تو اس کی ادبی حقیقت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہی کلام دوسرے عہد کے عام ادبی ذوق کے معیار پر رکھا جائے تو واقعی ایک داستان بن کر رہ جاتا ہے۔ لہذا غالب کے شاعری ذوق کو غالب ہی کے دور کی آنکھ سے اگر دیکھا جائے تو اس کا صحیح اندازہ ہوگا کہ غالب کی شاعری کا اردو ادب میں کیا مقام تھا۔ اور اردو کو اس نے کہاں سے کہاں پہنچایا ہے ؎

عین ایمان ہے انا الحق کا ترانہ لیکن
ہے یہی کفر اگر دیدۂ منصور نہ ہو

تھوڑے ہی دنوں کے بعد غالب کی اس اردو پر سر سید اسکول آف اردو کی ایک ایسی مستحکم بنیاد رکھی گئی کہ ۱۸۳۲ء میں ایک زبردست انقلاب آگیا اور اسی سال سرسید کی کوششوں کے نتیجے میں اس کو ایک ایسی مقبولیت عامہ حاصل ہوئی کہ سرکاری عدالتوں میں بجائے فارسی کے اردو زبان قرار پا گئی۔ قسمت کے ستارے کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ تیسرے دور سے نکل کر چوتھے دور میں داخل ہوئی جس کی ابتدا ۱۹۰۰ء میں رسالہ مخزن کے اجراء سے ہوئی جس کے ایڈیٹر آنریبل خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بالقابہ تھے۔ رسالہ مخزن کے اجراء نے اردو کی پہنائیوں میں کھلکنے والے نو تعلیم یافتہ نوجوانوں کو میدان ادب میں لا کھڑا کیا جن کی خدمات نے اردو

فتح الرحمان ایک تنقیدی مطالعہ

مولانا مسعود عالم قاسمی ــ ناظم شعبہ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ (ولادت ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء وفات ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) جس دور میں پیدا ہوئے وہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کا نقطۂ آغاز تھا اورنگزیب عالمگیر کے بعد سے جو حالات ابتر ہوئے تو مسلم حکومت کے سقوط پر منتج ہوئے بظاہر مسلمانوں کا یہ سیاسی زوال حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی اور نااہلی کا نتیجہ تھا مگر اس میں ملت کے ہر طبقہ کا کردار مضمر تھا پھر یہ زوال محض سیاسی نہ تھا بلکہ دینی واخلاقی علمی وثقافتی ہر پہلو کو محیط تھا، شاہ ولی اللہ نے بڑی باریک بینی سے ان سارے حالات اور ان کے اسباب پر غور کیا اور اس کے علاج کے لئے کمربستہ ہوئے شاہ صاحب کی اس اصلاحی جدوجہد کے دو پہلو تھے ایک وقتی اور ہنگامی دوسرے دائمی اور ہمہ جہتی۔

شاہ صاحب نے ایک طرف تو امت کے ہر طبقہ کی کمزوریوں کی نشاندہی کی اور ان کی تلافی کی طرف ان کو متوجہ کیا[۱] حالات جب زیادہ بگڑے تو بعض مسلم حکمرانوں کو مداخلت کی دعوت دی[۲] مگر وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جس قوم کی سیاست و نظم مملکت سے لے کر علم و اخلاق تک متاثر ہو چکا ہے اسکی اصلاح محض وقتی اور ہنگامی اقدامات سے نہیں ہو سکتی جب تک کہ کوئی پائیدار بنیاد امت کو فراہم کرنے کے لئے تلاش کی جائے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے ایک علمی تحریک برپا کرنے کی کوشش کی اور یہ ان کے نزدیک امت کے امراض کا واحد حل تھا۔

۱؎ التفہیمات الالٰہیہ ۔ ۲؎ ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات مرتبہ خلیق احمد نظامی

انہوں نے اپنی اس تحریک کی بنیاد قرآن پر رکھی اور قرآن کو امت مسلمہ کی قوت حیات سمجھ کر اس کی اشاعت اور خدمت پر آمادہ ہوئے۔ ایک طرف تو انہوں نے مروجہ اسلامی علوم پر قرآن کے نقطۂ نظر سے غور و فکر کیا اور اپنی بساط کے مطابق انکو رخ دینے کی کوشش کی اور دوسری طرف قرآن کو اپنے اصلاحی پروگرام کا مرکز بنایا صورت حال یہ تھی کہ مدارس دینیہ میں قرآن کی تفسیریں بھی پڑھائی جاتی تھیں اور جلالین الکشاف، مدارک التنزیل وغیرہ داخل نصاب بھی تھیں مگر ان سے قرآن فہمی کا ذوق پیدا ہونے کے بجائے فقہی اور فلسفیانہ جزئیات کو جلا ملتی تھی، عوام کا حال یہ تھا کہ وہ حلقہ بنا کر جامی کی نفحات الانس، عطار کی منطق الطیر، رومی کی مثنوی اور فارابی کی کتب قصص کا مذاکرہ کرتے تھے مگر قرآن کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے انفرادی طور پر جو لوگ قرآن پڑھتے تھے وہ محض تلاوت کو ہدایت اور نجات کے لئے کافی سمجھتے تھے اس کے معانی کو سمجھنے اور ان میں غور و فکر کو بالکل اہمیت نہیں دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ حق صرف عالموں کا ہے۔

شاہ صاحب نے اس صورت حال میں قرآن کریم کا سلیس مروجہ فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور عوام سے کہا۔

> "اگر تم انصاف سے کام لو تو نزول قرآن کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کی جائے اور اس کی ہدایت سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ قرآن کا صرف تلفظ مقصود نہیں ہے اگرچہ وہ بھی غنیمت ہے۔ مسلمانوں نے یہ کیا شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ وہ قرآن کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس شخص کو کیا سعادت نصیب ہو سکتی ہے جو قرآن کے مدلول کو نہیں سمجھتا"۔[۳]

۳؎ مقدمہ فتح الرحمٰن۔

پھر مسلمانوں کو قرآن کریم کے درس کا حلقہ بنانے اور قصے کہانیوں کی جگہ ترجمہ قرآن کو سننے سنانے کا اہتمام کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

"جس طرح یاران سعادت مند مولانا روم کی مثنوی، شیخ سعدی کی گلستان، شیخ فرید الدین عطار کی منطق الطیر، فارابی کے قصے، مولانا جامی کی نفحات الانس اور ان جیسی دوسری کتابیں مجلسوں میں پڑھتے ہیں کیا اچھا ہو اگر اسی طرح وہ قرآن کریم کے ترجمہ کو آپس میں پڑھیں اور اس کی تفہیم سے شغل خاطر کریں، اگر وہ اولیاء اللہ کے کلام کا مشغلہ ہے تو یہ شغل کلام اللہ ہے۔ اگر وہ حکیموں کے مواعظ ہیں تو یہ احکم الحاکمین کا موعظہ ہے اگر وہ عزیزوں کے مکتوبات ہیں تو یہ رب العزت کا مکتوب ہے۔" [۱]

شاہ صاحب نے قرآن کے اس ترجمہ فتح الرحمٰن کا آغاز سنہ ۱۱۴۳ھ یعنی سفر حرمین سے پہلے کیا تھا اور سورہ البقرہ اور آل عمران کا ترجمہ کر چکے تھے پھر حج کا ارادہ کیا اور حجاز تشریف لے گئے اس دوران ترجمہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا، سنہ ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے واپسی ہوئی اور ترجمہ کا سلسلہ پھر شروع ہوا اس طرح یہ ترجمہ شعبان سنہ ۱۱۵۱ھ میں مکمل ہوا اور سنہ ۱۱۵۶ھ میں منظر عام پر آیا اور اہل علم اس سے مستفید ہوئے۔

قرآن کی اشاعت کے لئے شاہ صاحب پہلے سے موجود بہت سے تراجم و تفاسیر میں سے کسی کو بھی منتخب کر کے اس کو رواج دے سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ ایک ترجمہ با مختصر حواشی رقم کیا، اس کی کیا وجہ تھی شاہ صاحب نے تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"یہ زمانہ جس میں ہم موجود ہیں اور یہ ملک جس کے ہم

---

[۱] مقدمہ فتح الرحمٰن

باشندے ہیں اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی تقاضا کرتی ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ روزمرہ کی متداول اور سلیس فارسی زبان میں، اظہار فضیلت، عبارت آرائی، متعلقہ قصوں اور توجیہات کا تذکرہ کئے بغیر کیا جائے تاکہ عوام و خواص یکساں طور پر سمجھ سکیں، اور چھوٹے بڑے سبھی معانی قرآن کا ادراک کر سکیں اس لئے اس اہم کام کا داعیہ فقیر کے دل میں ڈالا گیا اور اس کے لئے مجبور کیا گیا۔ اس سلسلہ میں دوسرے تراجم پر غور کیا تاکہ جو ترجمہ مناسب حال ہو اس کی ترویج و اشاعت کی کوشش کی جائے۔ اور جس طرح ممکن ہو اہل زمانہ کے لئے مرغوب ہو، لیکن بعض ترجموں میں بے کیف طوالت محسوس کی اور بعض ترجموں کو مخل حد تک مختصر پایا، کوئی ترجمہ اس میزان پر پورا نہ اترا لامحالہ نئے ترجمہ کی تالیف کا پختہ ارادہ کر لیا۔" [۱]

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ قرآن کا ترجمہ کرنے کی وجہ سے شاہ صاحب کی مخالفت کی گئی اور ان پر قاتلانہ حملے ہوئے حیات ولی کے مصنف نے ایک ہم عصر فاضل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس ترجمہ کے سبب مفسرین عصر کی نماز کے بعد شاہ صاحب پر حملہ آور ہوئے اور جب شاہ صاحب نے اپنا گناہ پوچھا۔ تو انہوں نے کہا "تم نے قرآن کا ترجمہ کر کے بالکل عوام الناس کی نگاہوں میں ہماری وقعت کو کھو دیا"، اور اسی بنا پر شاہ صاحب نے دہلی چھوڑ کر عرب جانے کا قصد کیا [۲]

کوثر سیریز کے مصنف شیخ اکرام نے بھی اس واقعہ کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور علماء کے مخالفانہ اور جاہلانہ

---

[۱] مقدمہ فتح الرحمٰن [۲] رحیم بخش حیات ولی ص ۲۲۰

رویہ پر افسوس ظاہر کیا ہے [1] مگر اس واقعہ کی تاریخی حیثیت قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتی اس کے کئی اسباب ہیں ایک تو یہ کہ اس وقت جب کہ شاہ صاحب نے خود بھی تذکرہ کیا ہے فارسی زبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم موجود تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے شاہ صاحب کے ترجمہ کی مخالفت کیوں کی گئی؟ کیا علماء واقعی برہمن پنڈتوں کی طرح اپنے مذہبی دستاویز کا مطالعہ کرنے کا حق عوام کو دینے کے لئے تیار نہ تھے یا وہ سمجھتے تھے کہ غیر عربی میں قرآن کا ترجمہ کرنا گناہ ہے؟ یہ دونوں باتیں ناقابل فہم ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاہ صاحب نے حرمین کا سفر ۱۱۴۳ھ میں کیا تھا اور یہ ترجمہ ۱۱۵۶ھ میں منظر عام پر آیا اس لئے ترجمہ کی مخالفت کی وجہ سے دہلی چھوڑ کر حجاز جانے کا قصہ بھی درست نہیں ہو سکتا۔ تیسرے یہ کہ خود شاہ صاحب کی تحریروں سے اس اہم حادثہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا حالانکہ شاہ صاحب نے اپنے خاندانی اور ذاتی حالات، و کوائف تفصیل سے لکھے ہیں اور جزئیات کو بھی قلم بند کیا ہے۔ اس کے برعکس شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ "جب فتح الرحمٰن کی تکمیل ہوئی تو معاصرین اس کی طرف متوجہ ہوئے" [2] شاہ صاحب تو معاصر علماء کی توجہ کا تذکرہ کرتے ہیں مگر ہمارے تذکرہ نگار حضرات ان کی مخالفت ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے دہلی کے حاکم نجف خاں کو اس شورش کا ذمہ دار قرار دیا ہے [3]

---

[1] شیخ محمد اکرام، رود کوثر ص ۵۵۲، لاہور ۱۹۸۶ء نیز ملاحظہ ہو مسلمانوں کے سیاسی افکار ص ۲۹۴، جائزہ تراجم قرآنی ص ۱، Indian Muslim P. 277 - اے ڈی مظفر نے بھی اس واقعہ کو غیر ضروری رنگ دے کر بیان کیا ہے ملاحظہ ہو مظفر کی کتاب Shah Waliullah a saint Scholar of Muslim India P. 91

[2] مقدمہ فتح الرحمٰن [3] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۳۶ امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ نجف خاں نے شاہ صاحب کے پہنچے اتروا دیئے، امیر الروایات ص ۳۶ نیز ملاحظہ ہو علماء ہند کا شاندار ماضی ۲/۵۲،

مگر یہ بھی خلاف واقعہ ہے کیونکہ شاہ صاحب کے عہد میں نجف خاں کا دہلی میں آنا ہی ثابت نہیں ہے نجف خاں شاہ عالم ثانی کے ساتھ ۱۱۸۵ھ مطابق ۱۷۷۱ء میں یعنی شاہ صاحب کے انتقال کے دس سال بعد دہلی میں آیا ہے [1] شاہ صاحب کے صاحب زادوں کے ساتھ اس کے معاندانہ رویہ پر کوئی کلام نہیں مگر جب دہلی میں اس کا کوئی وجود نہیں تھا تو پھر شاہ صاحب کے ترجمہ قرآن کی بنیاد پر ان کی مخالفت کا کوئی معنی نہیں۔

شاہ صاحب کا یہ ترجمہ اردو تراجم کا امام اور رہنما ہے، اسی ترجمہ نے شاہ صاحب کے صاحبزادوں کو تحریک دی کہ وہ فارسی اور اردو میں قرآن کی خدمت انجام دیں، چنانچہ شاہ عبد العزیزؒ نے فارسی میں فتح العزیز لکھی، شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین نے اردو میں ترجمے کئے اور پھر اردو زبان میں تراجم و تفاسیر کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ گویا فتح الرحمٰن قرآن کا صرف ترجمہ نہیں ہے بلکہ ترجمہ قرآن کی تحریک بھی ہے۔

خصوصیات ترجمہ

اس ترجمہ میں شاہ صاحب نے جن امور کو ملحوظ رکھا ہے ان کو حسب ذیل نکات میں بیان کیا ہے۔

(۱) ایک یہ کہ قرآن کی آیات کا انہی کے مطابق اظہار مراد اور لطافت تعبیر کے ساتھ معروف فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ دوسرے تراجم میں عبارت کی طوالت تعبیر کی رکاکت اور مفہوم کو سمجھنے میں جو دقت پیش آتی ہے حتی الامکان اس سے احتراز کیا گیا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ سارے ترجمے دو حال سے خالی نہیں ہیں یا تو قرآن کے قصوں کو ان میں مطلقاً چھوڑ دیا گیا ہے یا ان تمام کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس ترجمہ میں درمیانی راہ اختیار کی گئی ہے

---

[1] ولیم بیل، مفتاح التواریخ ص ۳۵۹، نول کشور کانپور ۱۸۹۶ء

(۳) تیسرے یہ کہ مختلف توجیہات میں عربی زبان و قواعد کے اعتبار سے زیادہ مستحکم، علم حدیث اور علم فقہ کے اعتبار سے زیادہ درست اور کم الفاظ کی توجیہہ کو اختیار کیا گیا ہے۔ جو کوئی تفسیر وجیز اور تفسیر جلالین جو کہ اس ترجمہ کی اصل کی حیثیت رکھتی ہیں اور دوسری تفاسیر کا مطالعہ کرے گا وہ اس میں ذرا بھی شک نہ پائے گا

(۴) چوتھے یہ کہ یہ ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ جو کوئی علم نحو سے واقف ہے یعنی قرآن کا اعراب، محذوف کی تعیین، ضمیر کا مرجع، لفظ کا محل وغیرہ جو کہ عبارت میں مقدم و موخر کیا گیا ہے وہ اس کو بخوبی جان سکتا ہے اور جو شخص نحو نہیں جانتا وہ بھی اصل مقصد سے محروم نہیں رہے گا۔

(۵) پانچویں یہ کہ قدیم تراجم کی دو صورتیں ہیں یا تو ترجمہ تحت اللفظ ہے یا ترجمہ حاصل المعنی۔ ان دونوں میں بہت سی دشواریاں (خلل) پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور یہ ترجمہ ان دونوں صورتوں کی کمزوریوں سے پاک ہے۔ ؎۱

اندازِ تفسیر

یہ ترجمہ چونکہ شاہ صاحب نے مسلمانوں میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کرنے کے لئے اور قرآن کی بنیاد پر زندگی کی تعمیر جدید کے لئے کیا ہے اس لئے ترجمہ میں مدعا کلام کی وضاحت کا حتی الوسع اہتمام کیا ہے، درمیان میں تشریحی الفاظ کا اضافہ کیا ہے اور آیات کے الفاظ کے بجائے پورے مفہوم کو سمیٹا ہے، اگرچہ وہ الفاظ سے صرف نظر نہیں کرتے اس انداز ترجمہ سے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں اور کسی مزید تفسیر کی ضرورت نہیں رہتی، بعد کے ادوار میں بہت سے اردو مفسرین نے اس انداز ترجمہ کو قوسین کی علامت کے ساتھ اپنایا ہے۔

مفسرین نے جن مقامات پر طول طویل بحثیں کی ہیں شاہ صاحب نے وہاں

؎۱ مقدمہ فتح الرحمٰن۔

سادگی اور صفائی سے گزرنے پر اکتفا کیا ہے اور بحث کے ان پہلوؤں کو چھیڑا ہی نہیں ہے جن میں الجھ کر ایک عام آدمی مقصد کلام سے دور ہو سکتا ہے۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

> "مشکل مقامات کی توجیہہ، متشابہات کی تاویل اور ان جیسے مقامات میں علماء کے درمیان اختلاف پیدا ہوا ہے۔ اگر تحقیقی نظر سے دیکھو تو یہ مذاہب اصل شرع نہیں ہیں بلکہ شریعت میں عقلی موشگافی کی ایک قسم ہے۔" ؎۱

اجتہادی ترجمہ

شاہ صاحب نے ان مقامات پر جہاں چند معانی اور مفاہیم کی گنجائش ہے اور مفسرین نے آیت کے مختلف معانی مراد لئے ہیں شاہ صاحب نے وہاں اپنے ذوق قرآن اور اجتہادی بصیرت سے ترجمہ کیا ہے اور عام مفسرین کی رائے کو اختیار کرنا ضروری نہیں سمجھا ہے۔ اس معاملہ میں اگر شاہ صاحب کو کوئی شاذ رائے ملتی ہے اور وہ قرآن کی حکمت سے ہم آہنگ ہے تو شاہ صاحب اسی کو اختیار کرتے ہیں، اس سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ شاہ صاحب کے پیش نظر جلالین اور وجیز دو تفسیریں تھیں مگر اس سے آگے بڑھ کر مفسرین کے اقوال اور اختلافات بھی پیش نظر تھے، مثال کے طور پر قرآن کی یہ آیت

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۤءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

(البقرہ ۱۴۳) شاہ صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں "و ہم چنیں ساختیم شمارا گروہ مختار تا گواہ باشید بر مردماں، و تا گواہ باشد رسول بر شما" وسط ایک جامع لفظ ہے اس کا ترجمہ مفسروں نے خیار، معتدل، اجود، اوسط وغیرہ کیا ہے۔ ؎۲

؎۱ مقدمہ فتح الرحمٰن [illegible] ؎۲ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر جلد اول تفسیر البقرہ آیت ۱۴۳۔
روح المعانی جلد دوم تفسیر آیت۔ الکشاف عن حقائق التنزیل [illegible] متعلقہ آیت

مگر شاہ صاحب نے یہاں "مختار" ترجمہ کیا ہے جو مقتضائے حال سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اس میں ضیاء معتدل، اجود، اوسط کے علاوہ قوت اور شوکت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس ترجمے نے آیت کے مفہوم کی عظمت کا سراغ بھی لگالیا ہے۔

اسی سورہ کی ایک دوسری آیت میں بھی شاہ صاحب کا یہ اجتہادی رنگ زیادہ نکھرا ہو نظر آتا ہے۔ "وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ" (البقرہ ۲۰۵) شاہ صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں "وچوں ریاست پیدا کند بشتابد در زمین تا تباہی کند درآنجا، و نابود سازد زراعت و مواشی را و خدا دوست ندارد تباہ کاری را"

اس آیت کے لفظ "تولّی" کو شاہ صاحب نے والی، حکمراں اور سربراہ حکومت کے معنی میں لیا ہے جبکہ عام طور پر مفسرین نے اس لفظ کو "ادبر" یعنی پھرنے کے معنی پہنایا ہے۔ صرف ایک مفسر ضحاک نے "والی" کا ترجمہ کیا ہے اور اسے زمخشری نے "قیل" سے ذکر کیا ہے۔[1] شاہ صاحب کے اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں خدا بیزار حکمرانوں کی نفسیات اور کرتوت کو بے نقاب کیا گیا ہے جو اپنی حکومت کے قیام اور حفاظت کے لیے انسانوں کا بے دریغ قتل عام کرتے ہیں اور معاشی و اقتصادی وسائل کا خاتمہ کرتے ہیں۔ سورہ النمل کی آیت ۳۴ اس مفہوم کے کچھ اور پہلو متعین کرتی ہیں۔ "إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۖ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ" (النمل ۳۴) بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے برباد اور اس کے معزز باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہی تو ان کا شیوہ ہے۔

موقع کلام کی نزاکت

فتح الرحمٰن کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں موقع کلام کی نزاکت کا احساس اور لحاظ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ یعنی ترجمہ محض الفاظ

---

[1] زمخشری، الکشاف من حقائق التنزیل تفسیر البقرہ آیت ۲۰۵

سے نہیں بلکہ صورت حال کے تناظر میں کیا جاتا ہے چنانچہ سورہ توبہ کی آیت "التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ" (۱۱۲) کا ترجمہ شاہ صاحب اس طرح کرتے ہیں "ایشاں توبہ کنندگان اند، عبادت کنندگان اند، حمد گویندگان اند، سفر در راہ خدا کنندگان اند، رکوع و سجدہ کنندگان اند"۔ یعنی اس آیت میں السائحون کا ترجمہ "خدا کی راہ میں سفر کرنے والے کیا ہے"۔ اسی انداز کی ایک آیت سورہ تحریم میں آئی ہے "عَسَىٰ رَبُّهُ إِن طَلَّقَكُنَّ أَن يُبْدِلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنكُنَّ مُسْلِمَاتٍ مُّؤْمِنَاتٍ قَانِتَاتٍ تَائِبَاتٍ عَابِدَاتٍ سَائِحَاتٍ ثَيِّبَاتٍ وَأَبْكَارًا" (تحریم ۵)

شاہ صاحب نے اس آیت میں سائحات کا ترجمہ "روزہ دارندگان" کیا ہے چونکہ سورہ توبہ میں مومن مردوں کا ذکر تھا اس لئے خدا کی راہ میں سفر کرنے والا کا ترجمہ زیادہ مناسب تھا، اور یہاں مومن عورتوں کا تذکرہ ہے جن کے لئے سفر کرنے کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں، اس لئے شاہ صاحب نے یہاں روزہ دارندگان ترجمہ کیا ہے۔

ترجمہ میں تنوع

شاہ صاحب نے بعض مواقع پر اس بات کی بھی رعایت کی ہے کہ اگر کوئی آیت ایک سے زیادہ مطالب پر حاوی ہے تو انہوں نے ایک ترجمہ پر اکتفا نہ کرکے دوسرے مطالب کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ شاہ صاحب اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ دونوں مطالب اپنی جگہ درست اور مناسب ہیں۔ مثلاً سورہ الرعد کی آیت "وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ۝" (الرعد آیت ۳۹) کا ترجمہ کرتے ہیں۔ "نشاید ہیچ پیغمبر را کہ بیارد نشانہ مگر بحکم خدا ہر قضائے موقت را نامہ ہست نابود می سازد ہر چہ می خواہد و ثابت کند ہر چہ خواہد و نزدیک اوست ام الکتاب یعنی لوح محفوظ"۔

اس کے بعد حاشیہ پر ایک دوسرے ترجمے کی نشاندہی اس طرح کرتے ہیں "وشاید کہ معنی چنیں باشد کہ ہر زمانہ را شریعت است نسخ می کند خدائے تعالیٰ آنچہ می خواہد وثابت می گذارد آنچہ خواہد ونزدیک اوست لوح محفوظ"۔

ترجمہ کی غنائیت

اس ترجمہ میں سلاست وروانی حسن ادا، جملوں کی خوبصورتی اور عبارت کی دلکشی کے ساتھ ایک طرح کی غنائیت اور صوتی آہنگ بھی پایا جاتا ہے۔ ایک قاری جس طرح قرآن کے الفاظ کو ادا کرکے لطف محسوس کرتا ہے شاہ صاحب اس لطف کو ترجمہ میں بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مثال کے طور پر سورہ الم نشرح کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے

الم نشرح لك صدرك	آیا کشادہ نکردیم برائے تو سینہ ترا،
ووضعنا عنك وزرك	ودور نکردیم از تو بار ترا،
الذي انقض ظهرك	آں بارکہ گراں کردہ بود پشت ترا،
ورفعنا لك ذكرك	وبلند ساختیم برائے تو ثنائے ترا،

اسی طرح اس ترجمہ میں بہت سے محاسن پوشیدہ ہیں جن کے اظہار کے لئے فرصت اور دقت نظر کی ضرورت ہے۔

فتح الرحمٰن ترجمہ کے علاوہ مختصر حواشی پر بھی مشتمل ہے، یہ حاشیہ الگ سے بھی شائع ہو چکا ہے[1] اس میں شاہ صاحب نے قرآنی آیات کی مختصر تشریح اور مشکل مقامات کی ضروری توضیح کی ہے بعض مقامات پر انتہائی اختصار سے کام لیا ہے ایک یا دو لفظوں میں مدعا بیان کر دیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس کی ہے قدرے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہ حاشیہ شاہ صاحب کی قرآن فہمی کا بڑا

---

[1] نزہتہ الخواطر ۶/۴۰۹، ڈاکٹر سالم قدوائی نے اس حاشیہ کو عربی تفاسیر کے ضمن میں بیان کیا ہے ملاحظہ ہو ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، مکرمہ مختاج ثبوت ہے

ثبوت ہے اور ان کے تفسیری رجحان کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں انہوں نے تفسیری اقوال، ذاتی خیالات، شان نزول، ربط آیات، ناسخ ومنسوخ، تحقیق الفاظ، فقہی احکام اور تمثیل ومحاکات پر گفتگو کی ہے گویا ایک طالب علم کے لئے مطالعہ قرآن کے دوران جن چیزوں کو جاننا ناگزیر ہے شاہ صاحب نے ایجاز کے ساتھ ان کو موضوع بحث بنایا ہے۔

اس حاشیہ کی نمایاں خصوصیت اختصار اور جامعیت ہے۔ مثلاً سورہ التوبہ کی آیت يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ (التوبہ ۔ ۷۳) کا ترجمہ یوں کیا ہے "جہاد کن با کافران وجہاد کن با منافقاں" اور حاشیہ پر صرف دو الفاظ لکھے ہیں۔ یعنی بسیف وزبان "اس کا مطلب یہ ہے کہ کافروں سے تلوار سے جنگ کرو اور منافقوں سے زبان سے۔ ان دو الفاظ کفار ومنافقین سے جنگ کرنے کی نوعیت کا پورا مسئلہ واضح کر دیا ہے۔ مگر کمال اختصار کے ساتھ۔

اسی طرح سورہ ھود کی آیت أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (ھود ۔ ۱۷) کا ترجمہ کیا ہے "آیا کسیکہ باشد بر حجتے از جانب پروردگار خود و متصل می آید گواہی از جانب پروردگار" اور حاشیہ پر دو الفاظ کا اضافہ کیا ہے (۱) دلیل عقلی (۲) قرآن۔ یعنی آیت مذکورہ میں بینہ سے مراد دلیل عقلی ہے اور شاہد سے مراد قرآن ہے۔ ان دو الفاظ نے آیت کے مفہوم کو بہت بلند کر دیا ہے۔ گویا مومن وہ ہے جس کے پاس اس کے ایمان کے لئے دلیل عقلی بھی ہے اور قرآن بھی جبکہ کافروں کے پاس نہ دلیل عقلی ہے اور نہ دلیل خداوندی بلا صرف گمان اور گہری تاریکی،

فقہی احکام کا لحاظ

حاشیہ میں شاہ صاحب نے آیات احکام کے ذیل میں فقہی جزئیات کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے فقہ حنفی کے علاوہ دیگر مکاتیب فقہ کو بھی پیش کیا ہے، تاکہ آیت کے

مفاہیم وضاحت کے ساتھ سامنے آسکیں چنانچہ

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(مائدہ - ۳) جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی کھائے بغیر میلان گناہ کے تو اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے - اس ذیل میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ

"مخمصہ میں مردار کھانا جائز ہے، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک "متجانف لاثم" کا فائدہ یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ کھائے اور امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک اس کا فائدہ یہ ہے کہ اضطرار کے وقت مردار کھانے کی رخصت چوروں اور ڈاکوؤں کے لئے نہیں ہے"

آیات احکام کی تشریح میں شاہ صاحب نے فقہا کے اقوال ہی نقل نہیں کئے ہیں بلکہ اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے مثلاً "اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ"
(مائدہ - ۵) کے ذیل میں لکھتے ہیں

"امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک محصنات اس جگہ پاک دامن و پارسا کے معنی میں ہے اور امام شافعی کے نزدیک آزاد کے معنی میں۔ غیر مسافحین سے معلوم ہوا کہ نکاح متعہ درست نہیں ہے اور ولا متخذی اخدان سے معلوم ہوا کہ خفیہ نکاح درست نہیں ہے"

علماء اہل سنت کے نزدیک نکاح متعہ درست نہیں ہے، مگر اس کی بنیاد وہ حدیث ہے جو حضرت سبرہ جہنی سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا "یا ایہا الناس انی قد کنت اذنت لکم فی الاستمتاع من النساء وان اللہ قد حرم ذلک الی یوم القیامۃ فمن کان عندہ منہن شئ فلیخل سبیلہ ولا تاخذوا مما آتیتموہن شیئا"[1]

(مسلم کتاب النکاح)

شاہ صاحب نے اس آیت سے استدلال کر کے حرمت متعہ پر نص قطعی کو ناطق بنا دیا ہے - اسی طرح "وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ" (النور - ۳۱)

زینت کے مقامات دو طرح کے ہیں - ایک تو وہ کہ جس کے چھپانے میں حرج ہے اور وہ چہرہ اور ہتھیلی ہے دوسرے وہ جس کو چھپانے میں حرج نہیں ہے، مثلاً سر گردن، بازو، بانہہ، پنڈلی، چنانچہ چہرہ اور ہتھیلی کا دوسروں کے سامنے چھپانا فرض نہیں ہے، بلکہ سنت ہے اور ان کے علاوہ دیگر مذکورہ چیزوں کا اجنبیوں کے سامنے چھپانا فرض ہے لیکن محرموں کے سامنے فرض نہیں ہے"

عورتوں کا چہرہ پردہ میں شامل ہے یا نہیں اس سلسلہ میں علماء کی اکثریت کا خیال ہے کہ وہ پردہ کے مقامات میں سے ہے تاہم ایک معتد بہ تعداد ان علماء کی ہے جو چہرہ کا پردہ لازم نہیں سمجھتے اور ان دونوں خیالات کے لئے قرآن و حدیث میں دلائل اور اشارات موجود ہیں، شاہ صاحب نے فرض اور سنت کی تقسیم کر کے صورت مسئلہ کو نہایت خوش اسلوبی سے واضح کر دیا ہے -

---

[1] حرمت متعہ کے لئے دوسری احادیث کے لئے ملاحظہ ہو - بخاری، کتاب النکاح باب نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نکاح المتعۃ اخیرا - موطا امام مالک، کتاب النکاح باب المتعۃ وغیرہ؛

جمہور مفسرین سے اختلاف

شاہ صاحب نے حاشیہ میں اپنی رائے کے اظہار کے ساتھ جمہور مفسرین سے اختلاف بھی کیا ہے اور ان کے اقوال پر نقد بھی کیا ہے اس سے شاہ صاحب کی مجتہدانہ بصیرت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے مثلاً سورہ النساء کی آیت

وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (۹۲) کے ذیل میں شاہ صاحب نے لکھا ہے

"جمہور مفسرین نے "وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق" کی تصویر کافر مقتول کو سمجھا ہے، اس بات کے پیش نظر کہ مومن اور کافر کے درمیان وراثت منقطع ہے اور سبیل دیت سبیل میراث ہے لیکن بندہ ضعیف کہتا ہے کہ مسئلہ کی تمہید "ما کان مومن ان یقتل مومنا الا خطأ" ہے اور زیر بحث مسئلہ میں وھو مومن کی قید قابل اعتبار ہے اور دیت کا لزوم ایفائے عہد کے لحاظ سے ہے نہ کہ بر سبیل میراث، اس کی مثال سورہ ممتحنہ میں قوم معاہد کی طرف سے آنے والی مومن عورت کا مہر ہے" [1]

سورہ النساء کی دوسری آیت "وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا" (النساء - ۱۰۱) کی تفسیر کرتے ہوئے شاہ صاحب کہتے ہیں۔

[1] شاہ صاحب نے جس مثال کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سورہ ممتحنہ کی آیت ۱۰ میں موجود ہے

"مشہور یہ ہے کہ یہ آیت صلوۃ مسافر کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور خوف کی قید اتفاقی ہے، لیکن اس بندے کے نزدیک قوی یہ ہے کہ یہ آیت صلوۃ خوف کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور سفر کی قید اتفاقی ہے؛ اور قصر سے مراد تعداد رکعات کے بجائے رکوع و سجود کی کیفیت میں قصر ہے، یعنی یہ کہ اشارہ سے ادا کی جائے گی"

شاہ صاحب کی اس تفسیر سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ حالت سفر میں قصر کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ اس آیت کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں جہاں تک صلوۃ سفر میں قصر کا تعلق ہے وہ نہ صرف احادیث صحیحہ سے ثابت ہے بلکہ خود شاہ صاحب نے ان کی حکمتوں پر متعدد مواقع پر روشنی ڈالی ہے چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔

ومنها ما صح به على المسافر في جزء من الصلوة والصوم بأن رفع الحرج مصلحة التيسير الا علة بالقصر والا فطار انما العلة هي السفر [1]

ازالۃ الخفاء میں شاہ صاحب نے اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کی ہے وہ لکھتے ہیں "راز اس مسئلہ میں یہ ہے کہ سفر اور خوف میں سے ہر ایک تخفیف صلوۃ کے مناسب ہے" [2]

شاہ صاحب کی انفرادیت

سورۃ الحج کی ایک آیت کی تفسیر میں مفسرین

[1] حجۃ اللہ البالغہ اول باب الفرق بین المصالح والشرائع مکتبہ رشیدیہ دہلی۔

[2] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص ۱۱۹ مطبع صدیقی بریلی۔

ضمانت باقی نہیں رہتی اور دین حنیف کا سرچشمہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب یہ واقعہ ہجرت حبشہ کے فوراً بعد یعنی سنہ ۵ نبوی کا ہے اور سورہ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیت معراج کے بعد نازل ہوئی ہے اور معراج کا واقعہ معتبر روایات کے مطابق سنہ ۱۰ نبوی کا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو پانچ سال بعد تنبیہ کی اور سورہ حج چونکہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے تو کیا یہ سمجھا جائے کہ اس کی وضاحت مزید تین سال بعد ہوئی؟ تیسرے یہ کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شیطان نے وہ الفاظ القا کئے تو اس کے بعد کے کلمات "اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ" کیا کافروں نے نہیں سنے تھے، جن میں ان کی اور ان کے معبودوں کی پر زور مذمت کی گئی ہے؟ یہ اور ان جیسی پیچیدگیاں ہیں جو واقعہ کی تفصیلات کو بے معنی بنا دیتی ہیں۔ اس جگہ شاہ صاحب کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ان واقعات سے صرف نظر کر کے آیت ہی سے مفہوم متعین کرتے ہیں اور کہنا چاہئے کہ ان کی تشریح نو بھی اور منفی خیز ہے انہوں نے لفظ "تمنی" کی وضاحت کی ہے اور اسی سے مسئلہ صاف کیا ہے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ وہ اس سرزمین کی طرف ہجرت کر چکے ہیں جہاں کھجور کے بہت سے درخت ہیں تو گمان ہجر کی طرف ہوا حالانکہ نفس الامر میں وہ مدینہ تھا یا مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ وہ مکہ میں داخل ہو چکے ہیں اور حلق و قصر کرا رہے ہیں تو گمان ہوا کہ اسی سال اس کی تعبیر پوری ہو جائے گی حالانکہ فی الاصل وہ چند سالوں کے بعد پوری ہوتی۔ اس قسم کی مثالوں میں مومنوں اور مخلصوں کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔"[۱]

لفظ تمنی کے ذیل میں شاہ صاحب نے یہ دلچسپ منظر بیان کر کے آیت کے مفہوم کو پیچیدگیوں سے پاک کر دیا ہے جن میں مفسرین الجھ کر رہ گئے ہیں۔

[۱] حاشیہ بر آیۂ مذکورہ

کرام سے عام طور پر لغزش ہوئی ہے یعنی "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ" (الحج - ۵۲)

کتب تفسیر و سیر میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جسے اس آیت کی شان نزول سمجھا جاتا ہے اور اس سے آیت کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے واقعہ یہ ہے کہ ہجرت حبشہ کے بعد ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ النجم تلاوت فرمائی اور جب "اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى" تک پہنچے تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ الفاظ طاری کر دیئے "تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتهن لترتجی"۔ جب کفار نے یہ سنا تو بولے بس اسی بات کا تو سارا جھگڑا تھا اب جبکہ محمدؐ نے ہماری دیویوں کی تعریف کر دی ہے تو ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔ چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختتام پر سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ کفار بھی سجدہ میں چلے گئے اس کی تنبیہ کے پیش نظر اللہ نے سورہ بنی اسرائیل کی یہ آیت نازل فرمائی "وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا" (الاسراء - ۷۳)

اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت رنجیدہ ہوئے تا آنکہ سورۃ حج کی مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ اس واقعہ کو تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ طبقات ابن سعد، تفسیر ابن جریر، ابن ابی حاتم وغیرہ نے بیان کیا ہے، حافظ ابن حجر، ابوبکر جصاص، زمخشری اور ابن جریر نے اسے درست قرار دیا ہے اس بنا پر آیت کا مفہوم کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔ حالانکہ مذکورہ واقعہ اور اس کی تفصیلات میں بہت سی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ یہ روایت حضرت سعید بن جبیر اور حضرت عبداللہ بن عباس کے واسطے سے متعدد طریقوں سے آئی ہے مگر ان میں سے کوئی طریقہ درست نہیں ہے اور اگر اس واقعہ کو تھوڑی دیر کے لئے درست مان لیا جائے تو کئی تضادات کو بھی قبول کرنا پڑتا ہے ایک تو یہ کہ اسی صورت میں وحی الٰہی کی کوئی

شاہ صاحب نے اپنی ایک کتاب میں لفظ شیطان کی بھی وضاحت کی ہے وہ لکھتے ہیں "شیطان سے مراد عالم تخلیط کی برائیاں ہیں اور ہر مقرب کو اس کی جسمانیت کے لحاظ سے تخلیط حاصل ہوتی ہے چنانچہ اس کے سینہ میں اس قسم کا وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ جس پر زندقہ کا شبہ ہوتا ہے لیکن جلد وہ مضمحل ہو جاتا ہے اور وسوسہ اس کے دل سے دور ہو جاتا ہے نسخ سے مراد وسوسوں کا ازالہ ہے [1]

تطبیق آیات وسُور

شاہ صاحب کے پسندیدہ موضوعات میں سے ایک موضوع تطبیق کا ہے، حاشیہ فتح الرحمن میں بھی انہوں نے اس کا لحاظ رکھا ہے اور سورتوں کے مضامین اور آیات کے مفاہیم میں حسب ضرورت تطبیق دینے کی کوشش کی ہے چنانچہ سورۃ الانعام کی آیت

وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ

(انعام ۱۱۵) کے ذیل میں لکھتے ہیں "مکی سورتوں میں مذکور ہے کہ یہود قرآن کی تصدیق کرتے ہیں اور مدنی سورتوں میں کہا گیا ہے کہ یہود اس کی تکذیب کرتے ہیں اس کی وجہ تطبیق ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے تو یہود کو اپنی شریعت کے اتباع کی دعوت نہیں دی تھی اس بنا پر عام یہود صدق قرآن کے معترف تھے کہ قرآن کا حکم عرب ہی پر لازم ہے اور ان میں سے کوئی اس کا انکار نہیں کرتا تھا اور جب آپ نے ہجرت کی تو ان کو بھی اسلام کی دعوت دی اس پر یہ لوگ عناد میں مبتلا ہو گئے"

اسرائیلی روایات

اسرائیلی روایات کے سلسلہ میں شاہ صاحب کے موقف

---

[1] الخیر الکثیر ص ۲۴۲

جب کہ مقدمہ میں خود انہوں نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے "اسرائیلی قصے جو کہ علماء اہل کتاب سے منقول ہیں نہ کہ خیر البشرؐ کی حدیث سے فتح الرحمان میں شامل نہیں کئے گئے ہیں سوائے اس جگہ کے جہاں ایسے معنی کی گرہ نہیں کھلتی اور ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں [1]

چنانچہ حتی الامکان فتح الرحمان میں شاہ صاحب نے اس ضابطہ کی پابندی کی ہے مگر بعض مقامات پر مسئلہ کا دوسرا رخ ان سے اوجھل رہ گیا ہے اور اسرائیلی روایت ان کے لئے حجاب بن گئی ہے مثلاً "هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ○ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○ (الاعراف: ۱۹۰، ۱۸۹) شاہ صاحب اس جگہ لکھتے ہیں "یہ حوا کے حال پر منطبق ہوتا ہے چنانچہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب حوا حاملہ ہوئیں تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور جب لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام عبد الحارث رکھ دیا"

شاہ صاحب نے جس روایت کو درست مان کر آیت کا انطباق کیا ہے وہ ساقط الاعتبار ہے سب سے پہلے اس کی سند پر نظر ڈالئے ابن جریر اس حدیث کی روایت محمد بن بشار عن عبدالرحمن عن عبدالصمد سے کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں اور امام ترمذی محمد بن مثنیٰ عن عبدالصمد سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں

"هذا حديث حسن غريب لا نعرفه الا من حديث عمر بن ابراهيم ورواه بعضهم عن عبد الصمد ولم يرفعه"

---

[1] مقدمہ فتح الرحمان

صورت حال یہ ہے کہ عمرو بن ابراہیم بصری ہیں ان کے بارے میں ابو حاتم الرازی نے کہا لا یحتج به یہ قول سمرہ کا ہے اور حدیث مرفوع نہیں ہے چنانچہ ابن جریر کہتے ہیں حدثنا ابن عبد الاعلی حدثنا المعتمر عن ابیہ حدثنا بکر بن عبد الله عن سلیمان التیمی عن ابی العلاء بن الشخیر عن سمرة بن جندب قال سمی آدم ابنه عبد الحارث ؂

حضرت حسن نے بھی اس آیت کی تفسیر کی ہے مگر انہوں نے یہ بات نہیں لکھی اگر ان کے نزدیک یہ سمرہ سے مروی حدیث مرفوع ہوتی تو وہ اس سے تجاوز نہ کرتے۔ ابن جریر کے بقول حضرت حسن نے کہا کہ یہ بعض ملتوں کے بارے میں ہے نہ کہ آدم کے سلسلہ میں ان تین اشکالات کے بعد حافظ ابن کثیر اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں "هذا ایضا والله اعلم موقوف علی الصحابی ویحتمل انه تلقاه من بعض اهل الکتاب من آمن منهم مثل کعب او وهب ابن منبه وغیرهما"؂

حافظ ابن کثیر کا یہ تبصرہ زیادہ صحیح ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کے مصداق کفار ہیں اگر حوا اس کے مصداق ہوتیں تو نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کی طرح ان پر بھی عتاب نازل ہوتا کیونکہ انبیا کی بیویوں کا معاملہ عام عورتوں سے مختلف ہوتا ہے۔ مزاج دین کا تقاضہ یہ ہے کہ معیار ثبوت کو گرانے کے بجائے روایت کے سقم کو قبول کر لیا جائے۔

مختصر یہ ہے کہ شاہ صاحب کا یہ ترجمہ مع حواشی، فتح الرحمان ایسے بہت سے قرآنی مباحث کو اجاگر کرتا ہے جن سے فہم قرآن کی گرہیں کھلتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی شاہ صاحب کا یہ کارنامہ اپنی نوعیت میں منفرد ہے، شاہ صاحب نے صرف قرآن کے ترجمہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ قرآن کے علوم کو عام کرنے کے لئے اصول تفسیر سے متعلق الفوز الکبیر اور فتح الخبیر لکھی، قرآنی قصص اور تمثیلات کی حکمتوں اور رمز کی وضاحت کے لئے تاویل الاحادیث لکھی اور قرآن کو

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر)

عبدالمغنی

سکندر علی اصلاحی

ایم۔اے شمسی دوگھروی

حلقۂ یاراں

محترمی! السلام علیکم!!

اکتوبر، نومبر، دسمبر ۸۹ء کے حیات نو میں مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ کے متعلق جو مضمون شائع کیا گیا ہے وہ بد مزاقی کا ایک نمونہ ہے اور اس میں بلا وجہ ایک محترم شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں جو حوالے ہیں اور ان کی تشریح جس غلط طریقہ سے کی گئی ہے وہ توڑ مروڑ کی ایک مثال ہے اور حقائق کو مسخ کر کے پیش کرنے کی ایک سعی نامشکور۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا آزاد اپنے دور میں دوسرے قائدین سے زیادہ قیادت کے اہل اور مستحق تھے اور خواہ ان کے ہاتھ پر سب لوگوں نے بیعت نہیں کی ہو، مگر امام الہند کی حیثیت سے وہ معروف و مشہور ہو چکے تھے، البتہ سنہ کے بعد جب مسٹر محمد علی جناح کو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے قائد اعظم کہنا شروع کیا تو مولانا آزاد کی امامت کا غلغلہ کم ہو گیا۔ بہر حال مولانا آزاد کی نیت پر حملہ اور انھیں جاہ طلب ثابت کرنے کی کوشش بڑی احسان فراموشی ہوگی اس لئے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو مولانا کے بعد آج تک دوسرا کوئی قائد نصیب نہیں ہوا ہے اور مولانا کی قائدانہ خدمات ملک و ملت دونوں کے لئے تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔

عبدالمغنی

مکرمی ایڈیٹر صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!!

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

عرصہ سے حیات نو موصول نہ ہونے کی وجہ سے بے قراری کا عالم ہے خدا اسے نظر بد سے محفوظ رکھے۔ یقیناً کسی علمی اور معیاری رسالہ کا نکالنا اور اسے برقرار رکھنا کوہ کنی اور جگر سوزی کا کام ہے۔ آخر حیات نو کے ساتھ بھی تو وہی مسائل ہوں گے جو ہوا کرتے ہیں۔ خدا کرے تمام پریشانیاں جلد از جلد ختم ہوں اور حیات نو اپنی شعاعوں سے مردہ جسموں میں روح پھونکتا رہے۔ نیز بہتر طور پر لوگوں کے لئے تحقیق و تدقیق کا سامان مہیا کرے۔ متعلقین کو سلام عرض ہے۔

والسلام خاکسار

سکندر علی اصلاحی

99 - S.S-SOUTH

A-M-U-

محترم!
تسلیمات!!

خدا کرے مزاج شگفتہ ہو۔

حیات نو آپ نے میرے نام روانہ فرمادیا اس کے لئے بیحد شکر گزار ہوں۔

رسالہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ پہلے کی بہ نسبت کافی نکھار آیا ہے مضامین کے معیار سے آپ کے انتخاب معیار کا بھی پتہ چلتا ہے

کاش اتنا اچھا رسالہ ہر ماہ دربھنگہ میں بھی آیا کرتا۔ کارلائق سے یاد فرمالیا کریں۔

مخلص

ایم۔ اے شمسی دوگھروی۔

ملک وسیم احمد متعلم جامعۃ الفلاح

اخبار علمیہ

شاہ فیصل ایوارڈ:- سعودی عرب کے ایک ممتاز عالم دین شیخ علی الطنطاوی اور پاکستان کے اسلامی اقتصادیات کے سرکردہ ماہر ڈاکٹر خورشید احمد کو سالانہ شاہ فیصل بین الاقوامی انعامی کمیٹی کے اعلیٰ ترین انعام سے مشترکہ طور پر سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ انعام ہر سال ان گرانقدر خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہے جو اسلام کے کسی بھی شعبہ میں انجام دی گئی ہوں۔ ڈاکٹر خورشید احمد جامعہ اسلام آباد میں بین الاقوامی ادارہ برائے معاشیات اسلام کے سربراہ ہیں۔ یونیورسٹی کے پروفیسر دل محمد عمر شابرا اور محمد الضریر کو مالیات اسلام کے شعبہ میں انکے تحقیقی کاموں پر مشترکہ طور پر اسلامیات کے انعام سے نوازا گیا۔ سعودی ماہر مالیات اسلام دکتور شابرا سعودی مالیاتی ایجنسی سے وابستہ ہیں اور ڈاکٹر الصدیق الضریر خرطوم یونیورسٹی سوڈان میں شریعت اسلامی کے پروفیسر ہیں۔ عربی ادب کے میدان میں مصری ادیب یحییٰ حقی کی خدمات اور کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں انعام سے نوازا گیا اور طب کا انعام ڈاکٹر ہنری ریٹ (برطانوی) اور ڈاکٹر کا برون (فرانسیسی) کو دیا گیا ہے۔ نیز دیگر علوم کی خدمت کے اعتراف کے طور پر ڈاکٹر مصطفیٰ السید (امریکی) اور ڈاکٹر کوٹون (امریکی) کو بھی انعام دیا گیا ہے۔ اس سالانہ انعام کی قیمت ایک ملین تین سو پچاس ہزار سعودی ریال ہے۔ جو کہ ٣٦٠ ہزار امریکی ڈالر کے برابر ہے۔

یہ ایوارڈ سعودی عرب کے مرحوم شاہ فیصل کی یاد میں دس سال پہلے جاری کیا گیا اور پہلا ایوارڈ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی زندگی ہی میں پیش کیا گیا تھا مولانا مرحوم ایوارڈ وصول کرنے خود نہیں جا سکے تھے، اپنی جگہ اپنے قریبی رفیق مولانا خلیل حامدی صاحب کو اس پیغام کے ساتھ بھیجا تھا کہ اگر میں جاتا تو عمرہ بھی کرتا اور دربار نبوی میں حاضری دیتا اور احباب سے ملاقات کرتا، اس سال کا ایوارڈ پانے والے ڈاکٹر خورشید احمد بھی جماعت اسلامی پاکستان کی نمایاں شخصیت ہیں۔

(اخبار العالم الاسلامی ۲۲ جنوری ۱۹۹۰ء)

رابطہ کا مسلمانوں کو ہدیہ :

مکہ مکرمہ رابطہ عالم اسلامی نے نیویارک کے رابطہ آفس کو ۸ کروڑ ۹۳۰۵ کلوگرام، صحیفے اور دیگر دینی کتابوں کا ہدیہ پیش کیا ہے۔ یہ کتابیں ایک اجتماع کے موقع پر تقسیم کرنے کے لئے بھیجی گئی تھیں جس میں خود رابطہ کے ایک نمائندے نے بھی شرکت کی تھی۔

(اخبار العالم الاسلامی ۹ جنوری ۱۹۹۰ء)

قرآن کریم کے ۱۰ لاکھ نسخے روسی عوام کے لئے :

سعودی حکومت روسی مسلمانوں کے لئے قرآن کریم کے دس لاکھ نسخے روس بھیجنے کے انتظامات کر رہی ہے، واضح رہے کہ سعودی عرب کسی بھی کمیونسٹ ملک سے سفارتی تعلقات نہیں رکھتا۔ قرآن کے نسخوں کی ترسیل کا معاملہ مذہب کے تعلق سے روسی حکومت کی لچکدار پالیسی کے بعد ممکن ہوا ہے۔ وہاں دوسرے ذرائع سے قرآن مجید کے نسخے اور لٹریچر بھیجے جا رہے ہیں نیز مغربی ملکوں سے بہت بڑے پیمانے پر دینی لٹریچر بھیجا جا رہا ہے۔

(سہ روزہ دعوت ۵ جنوری ۱۹۹۰ء)

* محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

سالانہ امتحان شروع ہو گیا ہے۔ جب یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا طلبہ امتحان سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو پہنچ رہے ہوں گے ۱۰ مارچ ۹۰ء کو آخری پرچہ ہو گا اور اساتذہ کرام ۲۱ مارچ ۹۰ء تک نتائج تیار کرنے کی کوشش کریں گے اور اس کے بعد ہی یہاں سے روانہ ہو سکیں گے۔ پھر دوبارہ جامعہ ۵ مئی ۹۰ء سے اپنے اگلے تعلیمی سفر کا آغاز کرے گی۔

لجنۃ الفلاح الخیریۃ کویت کے نمائندے جامعہ میں :-

لجنۃ الفلاح الخیریۃ کویت میں ایک ادارہ ہے۔ دینی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اس کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں اس کی طرف سے تعلیمی مراکز قائم ہیں۔ دارالفلاح اسلام آباد مورکی، جونپور کا نظم و انصرام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ۲ سال قبل یہاں ایک وفد کے ساتھ حاضر ہونے کا موقع ملا تھا، اس وفد میں استاذ گرامی مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی مولانا محمد رحمت اللہ الاثری صاحب فلاحی، مولانا مطیع اللہ صاحب فلاحی، مولانا نور محمد صاحب فلاحی، اور برادر محترم مولانا ظاہر صاحب عمری اور جناب تابش مہدی صاحب بھی تھے۔ طلبہ کے لئے رہائش کا معقول انتظام نظر آیا اور مسجد بھی شاندار پائی طلبہ کے لئے قالین کی صنعت سکھانے کا بھی اہتمام ہے۔ اس مدرسہ کا پورا خرچ

لجنۃ الفلاح الخیریۃ، کویت برداشت کرتی ہے۔

لجنۃ الفلاح الخیریۃ کے ہندوستان میں نمائندے جناب احمد ظاصاحب ۱۱ر فروری ۹۰ء کو جامعہ تشریف لائے موصوف اسکے پہلے بھی جامعہ تشریف لا چکے ہیں۔ وہ دارالفلاح اسلام آباد کے نظام تعلیم و تربیت کو بہتر بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ کئی بار جامعہ آتے ہیں۔ جناب احمد ظاصاحب فلسطین کے باشندے ہیں۔ موصوف کے اعزاز میں ایک پروگرام رکھا گیا آنھوں نے خلافت اسلامیہ کے قیام کی ضرورت واہمیت پر عربی میں تفصیل سے تقریر کی مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی صاحب نے مہمان گرامی کا تعارف کرایا اور استقبالیہ پیش کیا۔

الوداعیہ :- جامعہ کی طرف سے فارغ ہونے والے طلبہ کے ساتھ اساتذہ کرام کی ایک نشست ہر سال ہوا کرتی ہے۔ اس دفعہ ۲۲ر فروری ۹۰ء کو یہ نشست ہوئی۔ اس میں فارغین کی طرف سے عزیزان عبدالحمید اور ضیاالرحمان نے نظم میں اور محمد عثمان نے تقریر میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ بعدازاں مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی، مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی مولانا محمد عنایت اللہ صاحب سبحانی اور صدر جامعہ مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے بطور زاد اپنے جگر پاروں کو نصیحتیں کرتے ہوئے دین وملت کے تئیں ان سے نیک توقعات کا اظہار کیا۔

اسی دن اسی وقت کلیۃ البنات میں بھی فارغ ہونے والی طالبات کی ایک الوداعی نشست ہوئی جس میں انکی محترم معلمات نے ان سے نیک خواہشات کا اظہار کیا

جمعیۃ الطلبہ کے مقابلے :- طلبہ آج کل شب وروز امتحان کی تیاری میں مشغول ہیں۔ انکی سرگرمیاں، حفظ، تجوید، بیت بازی اور کھیل کے مقابلے کے ساتھ

ختم ہو گئیں۔ تقریر و تحریر کے بقیہ مقابلے، توقع ہے، شوال میں ہوں گے۔ ان مقابلوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ یہ تھے۔

مقابلہ تجوید :- عربی اول ودوم I عبدالمنان مظہر (مبارکپور اعظم گڈھ) عربی دوم — II محمد ابراہیم (نیپال) عربی دوم — III ابوبکر صدیق (حیدرآباد) عربی دوم — عربی سوم وچہارم I عزل الحق (نیپال) عربی سوم اور مطیع الرحمان حنیف (حیدرآباد) عربی سوم — II سہیل حسن (معروف پور) عربی چہارم۔ اور عبدالحق (جونپور) عربی سوم — III صداقت حسین (ڈہری آن سون) عربی سوم — عربی پنجم تا عربی ہفتم I محی الدین (نیپال) عربی ششم — II جاوید سلطان (اعظم گڈھ) عربی پنجم — III قمر عالم (مدھوبنی) عربی پنجم اور شمیم اختر (سہرسہ) عربی ششم۔

مقابلہ حفظ درجہ حفظ :- I مجیب احمد (اعظم گڈھ) — II عرفان احمد (گونڈہ) — III ضمیر المحسن (بدایوں) اور توحید احمد (اعظم گڈھ)

مقابلہ بیت بازی :- عربی پنجم تا عربی ہفتم۔ I محمد عثمان (ضلع بستی) عربی ہفتم اور عزیز الرحمان (سنبھل) عربی ہفتم — II خالد حسن رشید (کلکتہ) عربی ہفتم — III شمس نوید (بدایوں) عربی ششم اور ظفر احمد (لکھنؤ) عربی پنجم — عربی سوم وچہارم۔ I ابو صالح (اعظم گڈھ) عربی سوم — II رئیس احمد کاظ (اناؤ) عربی چہارم — III غلام نبی (کشمیر) عربی سوم — عربی اول ودوم۔ I نعمان بدر (بلدوانی) عربی اول اور غفران اختر (بستی) عربی اول — II رضوان احمد (اناؤ) عربی اول — III ثاقب حسین (بدایوں) عربی اول اور سید ابوبکر صدیق (حیدرآباد)

ہشتم وہفتم ثانوی — I عزیزالرحمان (بمبئی) — II عبیدالرحمان (سنبھل) — III ابو عمیر (اعظم گڈھ) — ششتم ثانوی — I محمد عرفان (اندور) II عنایت اللہ (بستی) — III محمد اعظم (اعظم گڈھ) — ابتدائی درجات I اختر حسین (بمبئی) — II حمید اللہ نیازی (بہار) — III حفیظ اللہ (گیا) ۔

فارم ۴

ماہنامہ مجلہ حیات نو

مقام اشاعت :	بلریا گنج اعظم گڈھ
وقفۂ اشاعت :	ماہنامہ
مالک :	انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ
پرنٹر و پبلشر :	نور محمد، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ
ایڈیٹر :	نور محمد، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ

میں نور محمد پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا وضاحتیں میرے علم واطلاع کے مطابق صحیح ہیں ۔

نور محمد

گذارش

براہ کرم خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں ۔ بصورت دیگر تعمیل میں تاخیر ہوسکتی ہے ۔

(ادارہ)

★ نائب ناظر جامعہ ڈاکٹر خلیل احمد

بہی خواہان جامعہ کی خدمت میں

آج کے طوفانی دور میں جب کہ ہر طرف مادیت کی یلغار ہے اور اخلاقی قدریں رو بزوال ہیں، اسلام پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور ملت اسلامیہ کو مختلف قسم کے چیلنجوں کا سامنا ہے، ایسے پر آشوب دور میں "جامعۃ الفلاح" ان چیلنجوں کا ایک پُرعزم جواب ہے جہاں مسلمان بچوں اور بچیوں کی اس انداز سے تعلیم وتربیت کی جاتی ہے کہ ان کے اندر کتاب وسنت کا گہرا علم پیدا ہو اور اسلامی اخلاق وکردار سے آراستہ ہوں، عصر حاضر کے افکار ونظریات سے واقفیت ہو اور ان کے اندر احیائے دین وشہادت حق کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ وہ وسعت قلب ونظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح اور دعوت اسلامی کے لئے اپنی صلاحیتوں کو وقف کر سکیں۔

نیچے جامعہ کے نمائندوں اور ان کے حلقۂ کار کی فہرست دی جارہی ہے ۔

براہ کرم بہی خواہان جامعہ، جامعہ کے ساتھ اپنی دلچسپیوں اور ہمدردی کا ثبوت دیں۔

(۱) جناب مولانا کمال الدین صاحب " شیخ اخلاق احمد "	بے روڈ ۔ باندرہ ۔ ماہم ۔ سانتا کروز جوگیشوری (؟) جوہو گلی ۔ اندھیری ۔ گورے گاؤں ۔ دھاراوی ۔ ولے پارلے ۔ جوگیشوری ۔ بوریولی ۔ دادر ۔ سائن ۔ پونا ۔ کرجت ۔ کسارہ ۔ کرلا ۔ گھاٹ کوپر ۔ چمبور ۔ ساکی ناکہ ۔ مرول ناکہ ۔ نیرالی روڈ ۔ بھانڈوپ ۔ وکرولی گوونڈی ۔ چیتا ۔ شیواجی نگر ۔ بیکن واڑی سلاٹر ہاؤس ۔ دیولار ۔
(۲) " قاری قربان احمد " " ماسٹر شہنواز احمد "	

(۲) جناب ماسٹر عبدالمالک صاحب — قلابہ ۔ نریمان پوائنٹ ۔ کرافٹ مارکیٹ
(۳) " " محمد خالد " — بھنڈی بازار ۔ نل بازار ۔ پٹھان واڑی ۔
جے جے ہاسپٹل ۔ ٹیکر ۔ کماٹی پورہ ۔ چوکی محلہ
بجر پالا سٹریٹ ۔ دو ٹانکی ۔ مدن پورہ ۔ جیراج
گلی ۔ عرب گلی ۔ مومن پورہ ۔ بائیکلہ ۔ سات
راستہ ۔ بدلو پورہ ۔ کاٹن گرین ۔ لیبر پورڈ
کالونی کاٹن گرین

(۴) " ماسٹر محمد حنیف " — بھیونڈی ۔ مالیگاؤں ۔ دھلیا ۔ ناسک ۔
" مولوی عرفان احمد " — ممبرا ۔ کوسہ ۔ کلیان ۔ امبرناتھ ۔ الہاس نگر
کرجت

(۵) " منشی محمد سہیل " — رامپور ۔ بلدوانی ۔ بریلی ۔ علی گڑھ ۔ آگرہ
کانپور ۔ لکھنؤ ۔ بنارس ۔ ایٹہ ۔ فیروز آباد

(۶) " مولانا صغیر احسن " — کانپور

(۷) " محمد محسن " — فیض آباد ۔ جلال پور ۔ ٹنگپور ۔ بسکھاری ۔
بھدرسہ ۔ بشنو بازار ۔ جہانگیر پور ۔ سلطانپور
بارہ بنکی

(۸) " مولانا عبدالرحمٰن خالد " — رسڑا ۔ شہر بلیا ۔ سکھ پورہ ۔ بیشن پورہ ۔ رتسڑ
باتھرا روڈ ۔

(۹) جناب مولانا نعیم الدین صاحب ۔ کلکتہ ۔ آسنسول

(۱۰) " " امیر الحسن " — بدایوں ۔ گگرالہ ۔ اردلیا ۔ اعلیٰ پور ۔ آہلت
" قاروق عالم " — بلند شہر ۔ مرادآباد ۔ حسن پور ۔ سنبھل ۔
امروہہ ۔

(۱۱) " " اظہار احمد " — دالی ۔ احمدآباد ۔ بڑودہ ۔ ادھنا ۔
" علی مرتضیٰ " — بلساڑ ۔ سورت ۔ مہسانہ ۔

(۱۲) " " احسان الحق " — اندور ۔ اجین وغیرہ ۔

(۱۳) " " جمیل احمد " — دہلی ۔ غازی آباد ۔ میرٹھ ۔ مظفر نگر ۔
دیوبند ۔ سہارنپور ۔ ہاپوڑ ۔

(۱۴) " " محمد اسماعیل " — پٹنہ ۔ مظفر پور ۔ بھاگلپور ۔ سیوان ۔

(۱۵) " ماسٹر ارشد عالم " — سوائی مادھوپور ۔ ادلی کلاں ۔ گنگاپور ۔
وزیر پورہ ۔ اجمیر ۔ بھیلواڑہ ۔ جے پور ۔ کوٹہ ۔
سیکر ۔ باران ۔ مانگرول ۔ فتح پور ۔ مکرانہ ۔
جودھپور ۔ پھلواڑہ ۔

(۱۶) " ماسٹر نظام الدین " — گورکھپور ۔ بستی ۔ سمریاواں بازار ۔ بانسی ۔
ڈمریا گنج ۔ اٹوا بازار ۔ بڑھنی بازار چھپرا

تلسی پور۔ بلرامپور۔ بہرائچ۔ بشن پور۔ گونڈہ۔
منکاپور۔ نان پارہ۔ کوئلہ باسہ۔

(١٧) جناب مولانا انور محمد صاحب	حیدرآباد۔ نظام آباد۔ محبوب نگر۔ وارنگل۔ عادل آباد۔ سکندرآباد۔ مشیرآباد۔ انگیا۔
(١٨) ” حافظ شمیم احمد ”	بھساول۔ جلگاؤں۔ برہان پور۔ ملکاپور۔ اکولہ اورنگ آباد۔ جالنہ وغیرہ۔
(١٩) ” ماسٹر توفیق احمد ”	دہلی۔ غازی آباد۔
(٢٠) ” مولانا مشتاق احمد ”	راوڑکیلا۔ نوادہ۔ جمشید پور۔ ترھٹ۔ گیا۔ رانچی۔ ہزاری باغ۔ جنت گڈھ۔ دھنباد۔
(٢١) ” انوار احمد ”	لار۔ دیوریا۔ برہج بازار۔ سلیم پور۔ ناگپور چاندہ۔ چھندواڑہ۔ سیونی۔ جبل پور

معذرت

خیال تھا کہ کتابت کی دشواریوں پر جلد قابو پا لیں گے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اور مجبور ہو کے یہ شمارہ بھی دو ماہ کا مشترکہ نکالنا پڑا ہے۔ ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ امید ہے قارئین ہماری دشواری سمجھ رہے ہوں گے۔

(ادارہ)

جامعۃ الفلاح

کی

ایک اہم گذارش

ملک کی معروف دینی درسگاہ جامعۃ الفلاح (بلریا گنج اعظم گڈھ) میں طلبہ اور طالبات کی تعداد اب چار ہزار سے بھی تجاوز کر رہی ہے جن کے لئے جامعہ کی موجودہ عمارتیں بالکل کفایت نہیں کر سکتیں درسگاہوں کی بھی شدید قلت کا سامنا ہے اور قیام گاہوں کی بھی۔ اس قلت کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے نئی عمارتوں کی تعمیر ازحد ضروری ہے۔ اس تعمیر کے لئے ضرورت کے مطابق زمین بحمد اللہ حاصل کی جا چکی ہے عمارات کا نقشہ بھی ماہرین سے بنوا لیا گیا ہے۔ اس پورے تعمیری منصوبے کے لئے مصارف کا تخمینہ کم و بیش سوا کروڑ روپے ہے۔ اس رقم کی فراہمی کے لئے مختلف رقموں کے کوپن چھپوا لئے گئے ہیں۔

دین و ملت کے خیر خواہوں اور جامعہ کے مخلصین سے پرزور گذارش ہے کہ جب ہمارے نمائندے آپ کی خدمت میں پہنچیں تو زائد سے زائد کوپن خرید کر اس اہم دینی کام میں تعاون فرمائیں۔

نوٹ: جن اصحاب خیر تک ہمارا کوئی نمائندہ نہ پہنچے وہ براہ کرم اپنی اعانتی رقم درج ذیل پتے پر ارسال فرما دیں۔

ناظم جامعۃ الفلاح بلریا گنج۔ ضلع اعظم گڈھ 276121

ڈرافٹ JAMIATUL FALAH BILARIAGANJ AZAMGARH کے نام بنوائیں۔ AC/No 20001 U.B.I. BILARIGANJ